صدف

۲۰۲۰ء اور ۲۰۲۱ء

خیر الاسلام ہائیر ایجوکیشن سوسائٹی

مہاراشٹر کالج

آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس

ڈاکٹر رفیق زکریا سینٹر فار پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ

NAAC Re-Accredited B++

۲۴۶۔اے، جہانگیر بومن بہرام روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸

Khairul Islam Higher Education Society's

MAHARASHTRA COLLEGE of Arts Science & Commerce

Dr. Rafiq Zakaria Centre for Post Graduate Studies and Research

Come, Build your Career with Maharashtra College, Mumbai

CARE Incubatee Ayman Tambe Successfully Launched his Enterprise *TAMBE SWEETS*

Ayman has been manufacturing and marketing ***'Sweets of Kokan'*** like methi ke laddu, khajuri, coco khajuri, almond khajuri, sandan, sakroli, duderi etc. from his home. To start with, he has strategically identified colony like BARC-Anushakti Nagar with a population of around fifty thousand. In the immediate future he intends to market his sweets through various malls in Mumbai.

Ejaz Shaikh has 2 Channels and 430k+ Subscribers on YouTube

Ejaz Shaikh a B.Sc.-IT graduate of 2020 established two YouTube Channels in 2017. ***'Ejaz Vlogs'*** to share NEWS related to Celebrities, Youtubers & Instagram Influencers and ***'Ejaz Lifestyle'*** for Roasting & Vlogging. His channels have 315k+ & 115k+ subscribers respectively and over 550+ videos collectively.

Star Of Maharshtra College 2020

24 Students Secured Admission in Various Fields of Medicine

3 in M.B.B.S.:-Zubeda Idrisi, Humera Idrisi **&** Hamna Ansari

3 in B.H.M.S.:- Shaikh Naveerah, Ansari Munazza, Bano& Shaikh Zubeda Akhlaque

2 in B.U.M.S.:-Balbale Unaiza Junaid & Ismat Faizi Abdul Matin

1 in B.D.S.:-Shifa Shoeb Ahmed Nagdawala

4 in B.P.T.:- Farheen Chandiwala, Shaikh Saadiya, Ansari Saba & Shaikh Areeb

3 in B.Pharm:- Mohammed Shadab Motorwala, Mohd. Amaan & Idridi Fatima

3 in B.Sc. in Occupational Therapy:-Ansari Shazia, Samiya Golandaz & Hiba Azmi

6 in Paramedical Lab Technician:- Shaikh Umme Sharmin, Nikhat Alyani, Ansari Naba, Ansari Muskan, Tamana Banoo Shaikh & Wajiha Fatima

خیر الاسلام ھائر ایجوکیشن سوسائٹی کے زیرِ اہتمام

مہاراشٹر کالج

آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، ممبئی

صدف

مجلسِ اِدارت

ڈاکٹر ماجد قاضی

پروفیسر آصف شیخ

مدیرہ

صبیحہ انصاری ۔ ٹی وائے بی اے

نائب مدیران

مومن صبا شعیب۔ ٹی وائے بی اے

الفیہ بانو عبدالوسیم بارہویں سائنس

رابعہ شیخ، ٹی وائے بی اے

شیخ زینب محمد صغیر، بارہویں سائنس

۲۴۶۔اے، جہانگیر بومن بہرام روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸

اِداریہ

تعلیمی نظام پر کرونا کے مہیب سایے

ماجد قاضی صدر شعبۂ اردو

دنیا کی معلوم تاریخ میں نہ جانے کتنی ہزار وباؤں کی تباہ کاریوں کا اندراج ہوا ہوگا اور کتنی زندگیوں کے اَتلاف کے شماریات جمع ہوئے ہوں گے مگر شاید ہی کسی وبا کا دائرۂ کار اتنا وسیع اور دورانیہ اتنا طویل رہا ہو کہ مریخ پر بستیاں آباد کرنے کا منصوبہ بنانے والے ترقی یافتہ انسان کی بے بسی ختم ہونے پر نہیں آتی اور ہر آن اپنا روپ بدلنے والے ایک چھوٹے سے وائرس نے اسے اندیشوں میں ایسا جکڑ رکھا ہے کہ اُس کی ساری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ ابھی ایسی کوئی تحقیق سامنے نہیں آئی ہے کہ کووِڈ۔ ۱۹ کے انسداد اور علاج کے سلسلے میں جتنے وقت، سرمایے اور صلاحیتوں کا استعمال ہوا ہے، اُن کو کن کن ترقیاتی منصوبوں میں استعمال کر کے کون کون سے اہداف حاصل کیے جاسکتے تھے۔ لیکن ایک عام ذہن اِس بات سے اتفاق ضرور رکھتا ہے کہ اِس بیماری نے ہمارے ملک کی معیشت کو کئی برس پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ اس دوران سرکار کی طرف سے جاری کیے جانے والے اعداد و شمار اور دعوے، عوام کے اپنے مشاہدات اور تجربات سے یک سر مختلف اور متضاد ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کھلی تضاد بیانی کا نتیجہ ہے کہ عوام کو ذرائع ابلاغ کے ساتھ وزیروں بلکہ وزیرِ اعظم کے بیانات بھی ناقابل اعتبار معلوم ہوتے ہیں۔ بے لگام سوشل میڈیا اور اس کے نادان دوستوں نے عوام کو دروغِ دیوزاد کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ تذبذب اور اضطراب کا ایسا دور دورہ ہے کہ کسی بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان تمام باتوں سے بے نیاز، ملک میں فرقہ واریت کا عفریت، بہ ہر صورت اپنے سیاسی آقاؤں کے مفادات حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ خوف کی نفسیات میں مبتلا مسلمانوں کے لیے بہت کڑا وقت ہے کیوں کہ یہ صورتِ حال اُن کے انفرادی و اجتماعی فیصلوں پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس موقع پر اگر مسلم قیادت نے باشعور کردار ادا نہیں کیا تو معلوم نہیں کہ مستقبل میں 'مفاہمت' کے نام پر مسلم نوجوان کا طرزِ عمل کیا ہوا اور وہ اپنی دنیا بنانے کے لیے ایمان و اخلاق کے کون کون سے اجزا کو تج کرنے پر تیار ہو جائے۔

شعبۂ تعلیم پر کووِڈ۔ ۱۹ کے منفی اثرات کو ہر عامی محسوس کر رہا ہے۔ حصولِ تعلیم کے بنیادی، ثانوی اور اعلیٰ مقاصد پر، اُس کی زد براہِ راست پڑ رہی ہے۔ طلبہ۔ سرپرست اور نظامِ تعلیم سے وابستہ ہر فرد، موجودہ صورتِ حال سے بے زاری اور گھٹن محسوس کرنے کے باوجود، مجبورِ محض ہے۔ جب تک حکومت اس پورے نظام کو بحال کرنے کا فیصلہ نہیں کرتی، ہر ایک کو اسی حصار میں رہتے ہوئے اپنے فرائض ادا کرنے ہیں اور 'بالکل نہیں سے کم از کم بہتر ہے' کی گردان کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں پر توجہ مرکوز رکھنی ہے۔ بنیادی و ثانوی تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلبہ کا نقصان ناقابل تلافی ہے کیوں کہ عمر کے جس مرحلے میں علمی بنیادیں اور تعلیمی تصورات، بہت تیزی سے ذہنوں میں جگہ بناتے ہیں اور مستقبل کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں، اُن کی عمرِ عزیز کا وہی حصّہ ضائع ہو رہا ہے۔ یہ معصوم تو احساسِ زیاں بھی نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ والدین کی معاشی و تعلیمی پس ماندگی نے بھی 'کم از کم' کی فراہمی کے عمل کو دشوار بنا دیا ہے۔ جس متوسط گھرانے میں اسکول جانے والے تین چار بچے ہوں، اُن کے لیے 'کم از کم' کی فراہمی کتنی دُشوار ہے اس کا بخوبی اندازہ اسکول کے اساتذہ

اور منتظمین کو بھی ہے لیکن ان مسائل کا حل بہر حال اُن کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے اور اسی لیے وہ بھی مفاہمت در مفاہمت پر مجبور ہیں۔ اعلیٰ جماعت کے طلبہ سنجیدگی سے اپنے تعلیمی مقاصد پر توجّہ دیں اور اپنے مستقبل سے متعلق فکر مند ہو کر کام کریں تو اس 'کم از کم' سے کچھ زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن مفاہمت تو بہر حال انھیں بھی کرنی ہے اور حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے رویے اور طریقۂ کار میں تبدیلی لانی ہے۔ اب تک کے تجربات یہ بتا رہے ہیں کہ آن لائن تعلیم و تدریس سے طلبہ و اساتذہ صرف رسمی طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ان دونوں گروہوں کا شاید ہی کوئی فرد اپنے عمل سے خود اپنے آپ کو مطمئن کر سکا ہے۔ جن مضامین کی تدریس میں صرف لیکچر کا طریقۂ کار کافی و شافی ہو سکتا ہے، وہاں بھی ترسیل کے مسائل نے یک سوئی کو دشوار بنا دیا ہے۔ دورانِ تدریس، اُستاد ہر لمحہ یقین و گمان کے درمیان جھولتا رہتا ہے کی آیا اُس کی آواز طلبہ تک پہنچ رہی ہے اور وہ اس کی تشریحات اور وضاحتوں کو توجّہ سے سُن پا رہے ہیں۔ اگر درس میں شامل تمام اراکین اپنے کیمرے آن رکھیں تو نیٹ ورک کا مسئلہ خاصا گمبھیر ہو جاتا ہے، مزید برآں طلبہ لیکچر سننے سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی تصویریں دیکھنے اور ان کے پس منظر سے لطف اندوز ہونے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر اُن کے اسپیکر آن ہو جاتے ہیں تو گھر کے دوسرے افراد کی آوازیں لیکچر میں نئی دل چسپیاں پیدا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی مدرّس بہت ہی مضحکہ خیز صورتِ حال سے دو چار ہوتا ہے، جب تین چار منٹ لگاتار بولتے رہنے کے بعد اچانک اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی آف لائن ہو گیا ہے۔ ایسے میں جس دل جمعی اور جوش کے ساتھ اُس نے موضوع کے کسی پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی، وہ نہ صرف ضائع ہو جاتا ہے بلکہ دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی اُلجھن اور کوششوں کے زیاں کے احساس سے اُس کے جذبے کی آنچ سرد پڑنے لگتی ہے۔ دوسری مرتبہ کی وضاحت میں اُس کا وہ دَم خم باقی نہیں رہتا۔ اس تین چار منٹ کے وقفۂ لاحاصل میں طلبہ کے انہماک میں جو خلل پڑتا ہے، اُس کا اثر لیکچر کے اختتام تک قائم رہتا ہے۔ جن موضوعات کی تدریس میں لیکچر کے ساتھ 'چاک بورڈ' کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے، وہاں اساتذہ اور طلبہ دونوں سخت آزمائش سے دو چار ہوتے ہیں۔ جس 'ایپ' کے توسط سے لیکچر منعقد ہو رہے ہیں، ان سے مکمل واقفیت کے باوجود 'ایپ' میں موجود تمام سہولتوں کا استعمال کرنا بہت آسان نہیں ہے۔ تکنیکی معلومات اور بھرپور منصوبہ بندی کے باوجود نہ اساتذہ کی تشفی ہوتی ہے اور نہ طلبہ کی تشنگی دور ہوتی ہے۔ اگرچہ استاد اپنے 'لیپ ٹاپ' کا اسکرین شیئر کر کے، موضوع کی تفہیم کے لیے ضروری خاکوں، تصویروں اور دیگر تدریسی لوازمات کو مختلف سلائیڈ کے ذریعے طلبہ کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن دوسری جانب موبائل فون پر لیکچر میں شریک ہونے والے طلبہ، اپنے چھوٹے اسکرین پر نہ پوری توجّہ سے انھیں دیکھ اور سمجھ پاتے ہیں اور نہ استاد کی وضاحتوں کو انہماک سے سُنتے ہیں۔ ان کی یک سوئی قائم نہیں رہتی اور نہ انھیں دورانِ تدریس، کسی نکتے کی وضاحت کے لیے سوال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس تشویش ناک صورتِ حال میں دونوں جانب سے مفاہمت کا رویّہ اختیار کرنے ہی میں عافیت محسوس ہوتی ہے۔ زبان دانی، معاشیات، نفسیات، ریاضی، اکاؤنٹس اور سائنس کے تمام مضامین کے اساتذہ اور طلبہ پوری سنجیدگی، ذہنی آمادگی اور احساسِ ذمہ داری کے باوجود مطلوبہ اہداف حاصل کرنے میں کُلّی طور پر کام یاب قرار نہیں دیے جا سکتے۔ مزید ظلم یہ ہے کہ تجربہ گاہوں میں کیے جانے والے عملی تجربات اور ان سے اخذ کیے جانے والے نتائج کا علم بھی، صرف آن لائن مشاہدے کا مرہونِ منت ہو کر رہ گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اس عمومی طریقۂ کار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انجینئرنگ، میڈیکل، پیرامیڈیکل مثلاً نرسنگ وغیرہ کے ساتھ اُن تمام اداروں میں جہاں، عملی مشق ہی کے ذریعہ مطلوبہ مہارتیں حاصل کی جا سکتی ہیں، تعلیم و تدریس کا نظم کس انتشار کا شکار ہوا ہے اور ان دو برسوں کی ناقص بنیادوں پر آگے بڑھا دیے جانے والے طلبہ کی پیشہ ورانہ

مہارت کا معیار و اعتبار کیا ہو سکتا ہے۔ آن لائن امتحانات نے مزید ستم ڈھائے ہیں۔ یونیورسٹی کی ہدایات کے مطابق صرف معروضی سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کے چار متبادل جوابات میں سے طلبہ کو کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اساتذہ کو بھرپور آزادی ہے کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے آدھے ادھورے نصاب کی بنیاد پر ایسا پرچہ تیار کریں جس میں طلبہ کی بھی سہولت ہو اور خود اُن کی تدریس پر بھی آنچ نہ آئے۔ امتحان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کم زور سے کم زور طالبِ علم نے امتیازی نمبروں سے کام یابی حاصل کی ہے اور اب پھلے نہ سماتا ہے۔ وہ خود اپنے تئیں اِس درجہ خوش فہمی کا شکار ہو گیا ہے کہ مستقبل کی دشواریوں کا خیال تک اس کے دل میں نہیں آتا۔

طلبہ و سرپرستوں کے معاشی مسائل اور لوازمات کے حصول کی دشواریوں کے درمیان، اس بات کا احساس تمام اساتذہ کو ہے کہ ہم نہ اپنے تدریسی فرائض پوری طرح سے انجام دے رہے ہیں اور نہ طلبہ کی تعلیم و تربیت صحیح ڈھنگ سے ہو پا رہی ہے۔ جن اساتذہ نے تن آسانی کو اپنا شعار بنا لیا ہے (اور ایسے اساتذہ کی کمی بھی نہیں) اُن کے لیے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے سو بہانے میسّر آ گئے ہیں لیکن ملّت کی تعلیمی پس ماندگی کا احساس و ادراک رکھنے والے باشعور افراد کے لیے صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہے۔ انھیں فوری طور پر اس ناگہانی مصیبت سے نکلنے کی راہ سجھائی نہ دیتی ہے اور عمومی بے بسی بلکہ کسی درجے میں عمومی بے حسی سے اُن کے دماغ معطل ہو رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جلد یا بدیر حالات ضرور معمول پر آئیں گے، ایسے تمام افراد ذہنی کرب و اضطراب سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف تعلیمی نظام کو بحال کرنے اور تعلیمی اداروں کو کھولنے کے تئیں صوبائی و مرکزی حکومتوں کی غیر واضح پالیسیوں اور مبہم حکمتِ عملی نے غیر یقینی صورتِ حال بنائے رکھی ہے تو دوسری طرف گرتی ہوئی معیشت اور اُٹھتی ہوئی مہنگائی نے سرپرستوں کو حاضر و موجود سے بیزار کر دیا ہے۔ دانش وروں کے تمام اندیشے سیاسی بازی گروں کی احمقانہ منطق کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ حکومتِ وقت نے اپنے مداحوں اور نقادوں دونوں کی زبانیں بند کر دی ہے۔ اس کا عمومی رویہ آتش لکھنوی کے اس شعر کے مصداق ہے:

اسیر اَے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں　　گرفتار آہنی زنجیر کا یہ ، وہ طلائی کا

کرونا کی مہاماری کے پیچھے نہ جانے کتنوں کی مت ماری گئی ہے اور نہ جانے کتنے۔ بہت ہوشیاری سے سازشیں رچنے اور کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں، اس کا ادراک ہونے اور نقصان کا اندازہ لگانے میں خاصا وقت لگے گا۔ فی الحال جس صورتِ حال کو ہم اپنا مقدر سمجھ کر جھیل رہے ہیں، اپنے تعلیمی مراحل طے کرتی ہوئی نئی نسل پر اس کی مار سب سے زیادہ پڑے گی اور اس طرح یہ اثرات برسوں پر نہیں دہائیوں پر محیط ہوں گے۔ جن طلبہ کو تعلیم نہیں تعلیمی اسناد سے بہرہ ور کیا جا رہا ہے اور جو اخلاقی اور پیشہ ورانہ تربیت سے یک سر محروم کر دیے گئے ہیں، اُن کے تئیں فکر مند ہونا اور اس نقصان کی تلافی کے لیے متبادل انتظام کرنا، بہت ضروری ہے۔ تعلیمی اداروں کے ذمہ داران، سرپرست اور اساتذۂ کرام کی مشترکہ فکر اور منصوبہ بندی سے مقامی سطح پر کوئی لائحہ عمل ترتیب دے کر ہی مستقبل کے خدشات سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کی جا سکتی ہے۔ اصلاحِ معاشرہ اور تعلیمی ترقی کے عنوان پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں، اس تعلیمی و تدریسی مثلث کو منظم و متحرک کرنے کا فریضہ ادا کرے تو یہ کام زیادہ آسانی اور بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ ہو سکے گا۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ڈاکٹر عبدالماجد انصاری، وائس پرنسپل

یہ دنیا مسائل سے پُر ہے۔اس دنیا میں انسانوں کو ہر گھڑی چھوٹے بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہی انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کو کیسے حل کرتا ہے۔کبھی کبھی بڑے مسائل جیسے قدرتی آفات بھی انسانوں کی جانچ کے لیے آتے ہیں اور ان غیر معمولی حالات میں انسانوں کو غیر متوقع اور غیر معمولی پریشانیوں سے جھوجھنا پڑتا ہے۔

موجودہ وباء کوڈ 19 بھی اسی طرح کا ایک امتحان ہے۔اس مشکل گھڑی میں ہمارے پاس دو متبادل ہوتے ہیں۔ایک یا تو ہم مایوس اور پریشان ہو کر شکوے شکایت کرنے لگیں یا ہمت و حوصلے سے ان حالات کا سامنا کریں اور ان میں سے کامیاب ہو کر باہر نکل آئیں۔

خود اعتمادی اور مضبوط قوت ارادی سے غیر معمولی حالات کو بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔جس طرح ہر سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاملے کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔اور سکہ دونوں جانب سے یکساں جسامت کا ہوتا ہے۔ٹھیک اسی طرح جتنی بڑی پریشانی ہوتی ہے اتنا ہی بڑا اس کا حل بھی ہوتا ہے،شرط یہ ہے کہ ہم انہیں ڈھونڈیں، پہچانیں اور ان پر عمل کریں۔

کہتے ہیں کہ ہر مشکل میں آسانی بھی چھپی ہوتی ہے اور جب مشکلیں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو ان میں سے ہی بہتر راستے نکل آتے ہیں۔ اسی لیے غالب نے فرمایا کہ

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

غیر معمولی حالات کی پریشانیوں کو مواقع میں تبدیل کرنے کے کچھ اہم نکات یہ ہیں۔

(۱) غیر معمولی حالات انسان کی قوت مدافعت بڑھاتے ہیں۔وہ ان حالات میں زیادہ فکرمند اور مستعد بن جاتا ہے اور مزید قوت کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت اسے غیر معمولی کامیابیوں سے ہمکنار کرسکتی ہے۔1997 کے عالمی مالی بحران میں غریبی، بے روزگاری، بھکمری بڑھ گئی تھی لیکن ان حالات میں انسانوں نے بہت کچھ نیا سیکھ کر دنیا کے مالی مسائل کو حل کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی تھی۔

(۲) غیر معمولی حالات میں انسان باہمی تعاون کرنے اور ایک دوسرے کا سہارا بننے کی تگ و دو کرتا ہے اس سے آپسی رشتے مضبوط ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو دشمن بھی دوست بن کر مدد کرنے لگتے ہیں۔

(۳) غیر معمولی حالات میں انسان منضبط اور مربوط حل تلاش کرنے لگتے ہیں جس سے ممکن ہے کہ برسوں پُرانے پیچیدہ مسائل کا بھی حل نکل آئے۔

(۴) بڑے اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے ایسے حالات میں بڑی اور مثبت تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں جن سے کئی مسائل کا حل سامنے آجاتا ہے۔مارچ 2011 میں جاپان میں سیلاب آنے سے اس کے چار نیوکلیئر ریئکٹرس تباہ ہو گئے جس کے بعد جرمنی کی چانسلر نے یہ حیرت انگیز اعلان کیا کی جرمنی اپنے نیوکلیئر ریئکٹرس خود سے بند کردے گا۔اور اس کی بجائے خود کو دوسری توانائی کے ذریعے خود کفیل بنائے گا۔

(۵) غیر معمولی حالات غیر معمولی صلاحیتوں کے احیاء کے لیے موزوں ترین اوقات ہوتے ہیں۔ مشکل انسان میں غیر معمولی ہمت اور حوصلہ بھر دیتی ہے اور اگر انسان مضبوط قوت ارادی سے آگے بڑھے تو اپنی چھپی ہوئی خوبیوں سے نہ صرف آشنا ہو جاتا ہے بلکہ ان کے استعمال سے خود کا اور ملک وقوم کا بہت فائدہ بھی کر سکتا ہے۔

(۶) پیچیدہ حالات انسان نے اندر احساس پیدا کر دیتے ہیں اور وہ آئندہ کے کسی مسئلے سے نمٹنے کے لیے خود کو پہلے سے تیار کرنے لگتا ہے۔ عام حالات میں ایک بے حسی طاری رہتی ہے جب کہ وبائی حالات اور مسائل انسانوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر شاندار مستقبل کی تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔

(۷) آفات انسان کو ایسا سبق سکھاتے ہیں جو وہ عام ماحول میں نہیں سیکھ سکتا۔ انسان ہمت، حوصلہ، برداشت، صبر، ہمدردی، آپسی مدد، مروت، بھائی چارہ، ملنساری، قربانی وایثار، فرائض کی ادائیگی اور اللہ سے لو لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اور یہ سب انسانوں کو جگانے کے لیے قدرت کی جانب سے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتے۔ انسان پرانے حالات کو یاد کرتا ہے، ان کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر ان سے سبق سیکھ کر زندگی کو دوبارہ پٹری پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۸) غیر معمولی حالات انسان کو مستقبل میں چوکنا رہنا سکھا دیتے ہیں۔ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی کر کے ایسے حالات سے نبرآزما ہونے کے لیے کمر بستہ ہو جاتا ہے تاکہ دوبارہ ان حالات میں نقصانات اور پریشانیوں سے بچا جا سکے۔

(۹) مشکل حالات میں اکثر دل نرم ہو جاتا ہے اور دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں، بند بات چیت دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔ اور ایک دوسرے کی پریشانی کو دور کرنے میں مددگار بن سکتے ہیں۔ یہ حالات تلخ رشتوں میں استواری لا سکتے ہیں۔

(۱۰) اکثر بڑی مصیبتیں اپنے ساتھ نئی راہیں بھی لے کر آتی ہیں۔ اگر انسان ہمت وہوش سے کام لے تو نت نئے مواقع اسے ترقی کرنے کی نئی راہیں دکھا دیتی ہیں۔

(۱۱) وبائیں انسان کو پیچھے ہٹنے، غلطی قبول کرنے، ناکام ہونے اور پریشانیاں جھیلنے کا سبق سکھاتی ہیں جس سے وہ ہمت سے دوبارہ اپنے کو سنبھالتا ہے اور زندگی کو واپس معمول پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۱۲) مشکل حالات کبھی کبھی نت نئی تکنیک کی کھوج کی وجہ بن جاتے ہیں اور اکثر نئی راہیں انہیں پریشانیوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔

مصیبتوں کو مواقع میں تبدیل کرنے کے لیے سماجی قائدین کا کردار اہم ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ افراد ہمت کر کے آگے آئیں تو خود کو اور پورے معاشرے کو غیر معمولی پریشانیوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ ایسے میں نوجوان طلبہ کے لیے بھی ایک زریں موقع ہوتا ہے کہ وہ وقت ضائع کیے بغیر اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں اور ملک وقوم کی ہر ممکن خدمت کریں۔

آخری داو

اظفر ریاض خان، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

صبح سے کاوش تاک میں تھا، کب اسے موقع ملے اور وہ دوستوں کے ساتھ باہر کھیلنے جائے۔ اس کے دوست بھی بار بار خستہ شہنشاہی دروازے کی دراڑوں سے اسے اشارہ کر رہے تھے۔ کاوش کی بیمار ماں کئی روز سے شدید کھانسی سے دو چار تھیں۔ سوکھی کھانسیوں کے جھٹکوں سے آنکھیں ابل کر آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور چھوٹی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر کچھ سوچتیں اور رونے لگتیں۔ کاوش ماں کے مرجھائے چہرے اور بھائی بہنوں کو ڈرا سہما دیکھ کر حالات سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا مگر دوستوں کے بلاوے اور ماں کی نصیحت کے درمیان میں وہ ہمیشہ الجھ کر رہ جاتا تھا۔ آج ماں نے اسے کئی بار تنبیہہ کی تھی کہ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر باہر مت جانا۔ ماں کی بگڑتی حالت اور بھائی بہنوں کو سنبھالنے کی ذمے داری نے اس کے قدم روک لیے تھے اور وہ دوستوں کے بلاوے کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اتنے میں ماں کی دیرینہ سہیلی فاطمہ خالہ دو عورتوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں۔ کاوش نے ماں کو عورتوں کی طرف متوجہ پا کر دروازے کی کنڈی دھیرے سے کھولی اور باہر نکل گیا۔

باہر دوست بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کاوش کو آتا دیکھ کر سب کی باچھیں کھل اٹھیں۔ چور سپاہی کا کھیل شروع ہوا۔ سارے دوست ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ فیصلہ کر چکے تھے۔ سب نے مل کر ہمیشہ کی طرح کاوش کو چور بنایا اور چھپ گئے۔ کاوش سب کو ڈھونڈھتا ہوا لوہار کی بیٹھک میں پہنچا تو سب نے اس کے سر پر ایک ساتھ چپت لگائی۔ سب کا ہاتھ ایک ساتھ پڑنے پر کاوش درد سے کراہنے لگا۔ سب خاموشی سے اس کا معائنہ کر رہے تھے مگر جمال کو کاوش کی اس حالت پر کوئی رحم نہیں آیا اس نے فوراً کہا ''یہ رونے دھونے کا بہانا مت کرو۔ تم چور ہو، جاؤ دوبارہ کہار کا کھمبا چھو کر آؤ ہم سب چھپتے ہیں۔'' کاوش نے سسکتے ہوئے کہا: ''نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ تم سب ہمیشہ بے ایمانی سے مجھے ہی چور بناتے ہو اور آخر تک مجھے ہی چور بنائے رکھتے ہو۔'' ناہید نے سمجھا بجھا کر کاوش کو دوبارہ چور بننے کے لیے تیار کیا اور وہ کہار کا کھمبا چھونے چلا گیا۔ ادھر بے ایمانوں کی ٹولی کاوش کو ستانے کے لیے دوسرے حربے تیار کرنے لگی۔ کاوش جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ہمیشہ وہی کیوں چور بنتا ہے، باقی سب صاف کیوں بچ جاتے ہیں؟ اس بار اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سب کو تلاش کرنے کسی کے قریب نہیں جائے گا اور تمام سپاہیوں سے ایک محفوظ دوری بنا کر رکھے گا۔ جب وہ پلٹا تو چاروں طرف سناٹا تھا، وہ کچھ دیر کھڑا سب کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی باہر نہیں نکلا۔ اس نے سوچا یہیں سامنے والی گلی میں سب چھپے ہوں گے۔ آگے بڑھ کر جھانکنا چاہیے۔ تبھی اس کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ اگر سکری گلی میں گئے تو سب دوبارہ ایک ساتھ ہلہ بول کر تمہیں تیسری بار چور بننے پر مجبور کر دیں گے اور اس پکڑ دھکڑ میں جو چوٹ لگے گی وہ الگ۔ کاوش کے پورے وجود میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایک ذرا سی غلطی پر اسے ہمیشہ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ سب اسے مارتے ہیں۔ جسمانی کمزوری کے سبب وہ کسی کو نہیں مار پاتا۔ کاش! ایسا ہوتا اس کے ابا پردیس نہیں جاتے تو وہ ان سے سب کی شکایت کر کے خوب بدلہ لیتا۔ کاوش نے ایک نتیجے پر پہنچ کر اپنے قدم پیچھے کھینچ لیے۔ محمود کا گھر بنانے کے لیے جو مٹی ڈھیر کی گئی تھی اس نے ایک چھوٹے ٹیلے کی

شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اس ٹیلے کی چوٹی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے چاروں جانب برابر نگرانی کی جا سکتی تھی۔ ادھر کاوش کے دوستوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اب تک انھیں ڈھونڈھتا ہوا اُن کے پاس کیوں نہیں پہنچا؟ جمال نے گلی سے باہر کی طرف جھانکا تو کاوش کہیں نظر نہیں آیا۔ میدان صاف دیکھ کر وہ باہر نکل آیا۔ اتنے میں کاوش نے زور سے ہانک لگائی ''جمال چور''۔ کاوش کی پھرتی دیکھ کر جمال لاجواب ہو گیا۔ اوروں نے سوچا کہ کاوش قریب ہے اور ایک ساتھ ہلہ بولنے پر اسے دوبارہ چور بنایا جا سکتا ہے۔ سب ایک ساتھ شور مچاتے ہوئے باہر نکلے۔ باہر کا نظارہ بالکل جدا تھا۔ کاوش نے اونچائی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سب کو چور بول کر اب وہ چور سے سپاہی بن چکا تھا۔ اب چور بننے کی باری جمال کی تھی۔

اپنی جیت پر کاوش بہت خوش تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ وہ اسی خیال میں مگن اپنی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے دوست ایک دوسرے کو کچھ اشارہ کر رہے ہیں۔ کاوش نے فوراً تقاضا کیا کہ چلو چھپتے ہیں، اب تو جمال چور ہے۔ کاوش کے آگے بڑھتے ہی اس کے پیچھے سے جمال اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا۔ ناہید نے کہا چور تو جمال ہے اور وہ بھاگ گیا ہے اس لیے کھیل ختم۔ کاوش کے منھ سے ہائیں! کی بیساختہ آواز نکلتے ہی اس کی ساری خوشی معدوم ہو گئی۔ وہ روہانسا ہو کر بولا: ''جب میں ایک بار بھاگا تھا تو تم سب مل کر مجھے میرے گھر سے کھینچ لائے تھے۔ چلو آج جمال کے گھر سے اسے پکڑ کر لاتے ہیں۔'' اس تقاضے پر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ تب کاوش نے سب کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: ''تم سب ملے ہوئے ہو۔ جب تک میں چور تھا تم سب مل کر بار بار مجھے ہی چور بناتے رہے اور جیسے ہی جمال چور بنا اسے بھگا دیا۔ یہ بالکل غلط بات ہے، تم سب بے ایمان ہو۔'' کاوش کے اتنا کہتے ہی عالم اپنی مینڈک جیسی گول مٹول آنکھیں باہر نکال کر آگے بڑھا اور پوری طاقت سے اس کا کالر اپنی طرف کھینچ کر گویا ہوا: ''اگر اب تم نے ہم سب کو ایک بار بھی بے ایمان کہا تو ہمیشہ کی طرح روتے ہوئے گھر جاؤ گے۔'' بے چارہ کاوش ہاتھ پیر سے کمزور تھا کسی کا مقابلہ کیا کرتا۔ بس اس کے پاس ایک گلا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا ''کہوں گا، ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گا، تم سب بے ایمان ہو۔'' اتنا سنتے ہی سب نے کاوش کو گھیر لیا اور مارنے لگے۔ کاوش مار کھاتا رہا مگر اس کی زبان نہیں رکی۔ سب تھک ہار کر الگ ہو گئے۔

کاوش روتا دھوتا اپنی ماں سے شکایت کرنے گھر کی طرف مڑا۔ گھر کے پاس اس نے محلے کی عورتوں کی بھیڑ دیکھی۔ سب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ رونا بھول گیا اور جلدی سے گھر کے اندر ماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی ماں خاموش لیٹی تھی۔ اس کے بھائی بہن فاطمہ خالہ کی گود میں دبکے عورتوں کی بھیڑ کو تعجب دیکھ رہے تھے۔ کاوش کی نظر پلنگ کے نیچے پڑی، خون کی کئی لمبی لکیریں جم چکی تھیں۔ کاوش کے ننھے دماغ میں ایک جھماکا ہوا، اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ باہر کی گھات اور قدرت کی مار نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ اس نے فاطمہ خالہ کو دیکھا تو اس کی خاموش آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر بکھر گئے۔ فاطمہ خالہ نے لپک کر اسے سینے میں چھپا لیا۔ ہائے میرا کاوش اتنی چھوٹی سی عمر میں یتیم ہو گیا۔ ساری عورتیں اس منظر کو دیکھ کر سسکنے لگیں۔

حالات چاہے کتنے ہی ناموافق ہوں، زخم چاہے کتنا ہی گہرا ہو۔ وقت ایسا چارہ گر ہے جو زخم کو بھر دیتا ہے اور حالات سے نباہ کرنا بھی سکھا دیتا ہے۔ ماں کی ناگہانی موت کے بعد کاوش کی دادی نے گھر بار سنبھال لیا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ گاؤں کے مکتب میں چوتھی جماعت پڑھ چکا تو دادی نے پڑوسی رحیم کے ہاتھ پر پیسہ رکھتے ہوئے گاؤں سے پانچ میل دور ہائی اسکول میں داخلہ کرانے کی سفارش کی۔ رحیم چاچا نے سمجھایا: ''اسکول دور ہے۔ اسے تو سائیکل چلانی بھی نہیں آتی، اتنا دبلا پتلا وہاں تک پیدل کیسے جائے گا۔'' مگر دادی پوتے کی ضد کے آگے ہار چکی

تھی۔لہٰذا داخلہ ہوگیا۔کاوش کے سارے دوست سائیکل سے اسکول جاتے تھے اس لیے کم وقت میں پہنچ جاتے تھے۔ کاوش کے ساتھ صرف ناہید پیدل جاتا تھا۔ان دونوں کو دوسروں سے ایک گھنٹہ پہلے تیار ہو کر نکلنا پڑتا تھا۔محمود، عالم، جمال، ارشد، فہیم، سہیل، متین اور اختر سائیکل سے جاتے تو کاوش ہانپتا کانپتا ان سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا، اس کوشش میں وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا۔اسکول کے قریب جب سائیکل والوں کی ٹولی قریب آتی دکھائی دیتی تو کاوش کے بدن میں بجلی دوڑ جاتی۔وہ پوری سرعت سے کلاس روم میں پہنچ کر سب سے آگے بیٹھنے کی کوشش کرتا۔سائیکل پر سوار جمال دبلے پتلے کاوش کو پیدل آگے بڑھتا ہوا دیکھتا تو اس کا خون کھول اٹھتا اور وہ بھی سائیکل کو تیزی سے چلاتے ہوئے اس سے آگے نکل کر پہلی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کرتا۔کاوش پیدل اور جمال سائیکل سوار۔اسے سائیکل اسٹینڈ میں کھڑی کر کے آنے میں وقت لگتا اور اس دوران کاوش پہلی سیٹ پر اکثر براجمان ہو جاتا تھا۔جمال کئی دن تک اس ہار کو برداشت کرتا رہا۔جب کوشش کے بعد بھی کامیابی نہیں ملی تو اس نے سائیکل ٹولی کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان سے آدھا گھنٹہ پہلے گھر سے نکلنے لگا۔راستے میں کاوش ملتا تو وہ اس کے سر پر چپت لگا کر تیزی سے آگے نکل جاتا۔کاوش لاکھ دوڑتا مگر وہ سائیکل کی رفتار کا فائدہ اٹھا کر پہلی سیٹ پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اب کاوش کی باری تھی، اس نے ناہید سے کہا کہ اب ہمیں اور پہلے گھر سے نکلنا چاہیے۔تبھی جمال سے پہلے اسکول پہنچنا ممکن ہوگا۔ناہید نے صاف منع کر دیا کہ اتنا پہلے پہنچ کر کیا ملے گا؟ ادھر کاوش نے تہیہ کر لیا تھا۔اگلے دن وہ اکیلے ہی تھوڑا اور پہلے گھر سے نکلا۔راستے بھر جمال اسے تلاش کرتا رہا۔ اسے لگا ہوسکتا ہے آج کاوش اسکول نہیں آیا ہو۔وہ اسٹینڈ پر سائیکل کھڑی کر کے خراماں خراماں کلاس روم میں داخل ہوا تو کاوش پہلی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔جمال کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس نے بستہ زور سے میز پر پٹخا اور کاوش کو کھینچ کر زمین پر دے مارا۔جب تک کراہتا چیختا کاوش زمین سے اٹھتا جمال اپنے بستے کے ساتھ پہلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔کاوش اس صریح ظلم کے خلاف بپھر چکا تھا، وہ اپنے ڈر پر قابو پاتے ہوئے جمال کی گردن پکڑ کر جھول گیا۔جمال نے دوبارہ اس کو دور پھینکنا چاہا مگر وہ جمال کے جسم سے جونک کی طرح چمٹ چکا تھا۔ادھر سے ناکام ہو کر جمال نے اس کی کمر پر گھونسے برسانے شروع کیے۔درد سے بلبلاتے کاوش نے جمال کی کلائی پر اپنے دانت گڑا دیے۔دونوں گتھم گتھا تھے۔ اتنے میں گاؤں کی سائیکل ٹولی کلاس روم میں داخل ہوئی۔سب نے مل کر دونوں کو چھڑایا۔کاوش اپنی کمر پکڑے بلک بلک کر رو رہا تھا۔محمود کے پوچھنے پر اس نے جمال کی زور زبردستی کے بارے میں بتایا۔جمال نے کاوش کے دانتوں کے نشان کو دکھا کر اپنا دفاع کرنا چاہا اسی وقت محمود کا ایک زناٹے دار تھپڑ جمال کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔محمود نے گرج دار آواز میں کہا ”بے ہوہ میں کئی دنوں سے تمہاری حرکت دیکھ رہا ہوں، تم اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔تم جیسے تندرست کو یہ ہڈی چمڑے والا لڑکا کیسے مار سکتا ہے۔“اس وقت سب کو کاوش پر ترس آرہا تھا۔سب نے مل کر جمال کو ڈانٹا۔آخر صلاح مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ کل دونوں میں سے جو سب سے پہلے آکر اس سیٹ پر بیٹھے گا، ہمیشہ کے لیے یہ سیٹ اس کی ہو جائے گی۔

اگلے دن کی تیاری دونوں نے آج ہی سے شروع کر دی تھی۔طرح طرح کی پلاننگ ہو رہی تھی۔دوستوں کے دو حلقے بن گئے تھے۔کاوش سب کی بات سن رہا تھا مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ”سنو سب کی کرو اپنی“۔اس نے بھور میں ہی اٹھ کر اسکول جانے کا من بنا لیا تھا۔دوسری طرف جمال کو اپنی سائیکل پر ناز تھا پھر بھی اس نے روزانہ کے معمول سے پہلے جانے کی تیاری کی۔اگلے دن جمال بہت جلد تیار ہو کر کاوش کے گھر پہنچا۔اس کی دادی سے معلوم ہوا کہ وہ تو کب کا اسکول جا چکا ہے۔جمال کے اوسان خطا ہو گئے۔اس نے گھر سے بستہ بھی نہیں لیا اور سائیکل پر سوار ہو کر سرپٹ اسکول کے لیے روانہ ہوگیا۔کاوش تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اسکول کی طرف رواں دواں تھا۔اسے پوری امید تھی کہ جمال جیسا دیر تک سونے والا

لڑکا اتنی جلد بیدار ہو کر اسکول نہیں آسکتا۔ جیت کی امید دوگنی ہوتے ہی اس کے جسم میں بجلی کوندنے لگی۔ وہ اور تیزی سے اسکول کی طرف بڑھنے لگا۔ سورج نکل چکا تھا۔ لوگ اپنے کھیتوں میں چہل قدمی کررہے تھے۔ دور اسکوا [illegible] جھلملا رہا تھا۔ جمال کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کاوش کو اب اپنی جیت کی پوری امید تھی۔ وہ انھیں خیالات میں مگ ہی تھا کہ اچانک اس کے سر پر ایک تیز چپت پڑی اور اسی کے ساتھ جمال کا قہقہہ منھ چڑھاتا ہوا فضا میں تحلیل ہوگیا۔ کاو پاتا جمال اس سے بیس تیس میٹر آگے جاچکا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے دوڑ لگائی مگر کوشش کے باوجود دوری بڑھتی گئی۔ اسے دیر سے بیدار ہونے کے بعد بھی آج کاوش پیچھے تھا اور کاہل جمال جیت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کاوش جب اسکول کے گیٹ میں داخل ہوا تو جمال اپنی سائیکل سے اتر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دوڑ لگا کر آخری کوشش کی مگر جمال نے آج اسٹینڈ میں سائیکل کھڑی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے سائیکل وہیں پھینکی اور دوڑ کر کلاس روم میں پہلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ پسینے میں شرابور کاوش جب کلاس روم میں پہنچا تو جمال کی ہنسی اس کا منھ چڑھا رہی تھی۔ کاوش چپ چاپ پیچھے کی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمال لگاتار اس کو اپنی باتوں اور ہاتھ کے اشاروں سے پریشان کررہا تھا مگر گم سم کاوش کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ جمال اپنی جیت کو سیلی بریٹ کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت کاوش کے علاوہ کلاس روم میں کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے ٹیچر کی میز سے چاک اٹھایا اور اسے توڑ توڑ کر کاوش کو مارنے لگا۔ کاوش ابھی بھی خاموش تھا جیسے طوفان سے پہلے کی خاموشی۔ وہ جمال کی ہر نازیبا حرکت کا جواب اپنی مکمل خاموشی سے دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کاوش کے کان کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں محمود کی آواز آئی: ”آج جو پہلے آکر سیٹ پر بیٹھے گا وہ سیٹ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی۔ اس طرح روز روز کی جھک جھک سے چھٹکارا مل جائے گا“۔ جمال پہلی سیٹ پر جما ہوا تھا۔ کاوش کو جب یقین ہو گیا کہ سائیکل ٹولی دروازے کے قریب آچکی ہے تو اس نے جھٹ سے اپنا بستہ دروازے کی طرف پھینکا اور سر کو دیوار سے دو بار زور زور سے ٹکرا کر زمین پر لوٹ پوٹ کر رونے لگا۔ جب گاؤں کی سائیکل ٹولی کلاس روم میں داخل ہوئی تو کاوش کے سر سے خون رس رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ اس کے بستے سے کتابیں نکل کر دروازے کے آس پاس بکھری پڑی تھیں۔ جمال منھ کھولے کاوش کے اس آخری داؤ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ شل اور زبان پر تالا پڑ چکا تھا۔ سب نے قہر آلود نگاہوں سے جمال کو دیکھا اور ایک ساتھ اس پر پل پڑے۔ مار کھاتا ہوا جمال چیختا چلاتا رہا مگر اس کی بات کوئی نہیں سن رہا تھا۔ سب نے اسے کھینچ کر پیچھے بٹھا دیا۔ ناہید نے کاوش کی بکھری ہوئی کتابوں کو یکجا کر کے بستے میں رکھا۔ محمود نے کھڑا کر کے اپنے رومال سے اس کی پیشانی صاف کی۔ سب نے مل کر اس کے کپڑے صاف کیے۔ جمال نے ایک بار پھر سچائی بتانی چاہی مگر ساتھیوں کا تیور دیکھ کر سہم گیا۔ سائیکل ٹولی نے بڑے احترام سے کاوش کو پہلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ جمال نے اپنی جیت کو ہار میں بدلتے ہوئے دیکھ کر مایوسی سے گردن جھکا لی۔ کاوش نے اپنی آستین سے آنسو پونچھے تو اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔

کرونا اور ممکنہ ڈراپ آوٹ

پروفیسر انعام الرحمن ابواللیث۔ ڈپارٹمنٹ آف کامرس

جدید اور ترقی یافتہ دنیا کی مختصر سی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں طلباء کا کردار نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس دنیا میں طلباء تبدیلی اور مزاحمت کے مرکزی کردار کے طور پر نظر آتے ہیں۔ گویا عمر کے اس طبقہ کے افراد میں جدید دنیا کو نیا رخ دینے کی طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ اس سے قبل دنیا کے مستقبل کے فیصلے معمر اور ادھیڑ عمر کا بادشاہ یا چرچ میں موجود سفید ریش پادری کیا کرتے تھے۔ اس دور میں طلباء یعنی نوجوان طبقہ کو وہ اہمیت و مرکزیت حاصل نہ تھی جسے متعدد تہذیبوں کے عروج و زوال کے بعد جدید دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ اب طلبہ کسی بھی ملک و قوم کا سرمایہ تسلیم کیے جاتے ہیں اور مستقبل کے خدوخال کا تعین کرتے وقت انہیں فوقیت دی جاتی ہے۔ امریکہ، ایران، ترکی اور ہندوستان ایسے ممالک ہیں جن میں گزشتہ ایک صدی میں طلباء نے اپنی نہ صرف نمایاں موجودگی درج کرائی بلکہ ان ممالک کے مستقبل کا رخ طلباء اور نوجوانوں کی رائے کی بنیادوں پر ہوا ہے۔ ان سطور کا مقصد یہ ہے کہ طلباء کو جدید دنیا میں ان کے مقام و مرتبے اور اس کے تحت ان پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس کرایا جاسکے۔

جدید دنیا کی بنیادیں تعلیم پر رکھی گئیں ہیں اور حصول تعلیم کے بغیر اس دنیا میں جدوجہد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس دنیا میں تعلیم کا تصور بھی تبدیل ہوگیا ہے۔ وہ دن گزر گئے جب کسی ایک استاد سے دنیا کے تمام علوم حاصل کیے جاسکتے تھے اور اساتذہ بھی تمام علوم میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ یہ علم سے زیادہ کوالفکیشن (Qualification) کا زمانہ ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ جدید تصورِ تعلیم میں علم سے زیادہ اہمیت کوالیفکیشن (Qualification) کو حاصل ہے۔ اگر آپ سلسلہ تعلیم ترک کرنے کے بعد اپنے طور پر دنیا کے تمام علوم میں طاق ہوجائیں تب بھی آپ کی qualification صفر ہی رہے گی۔ اس لیے تعلیم کو ترک کر دینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ یہ بذات خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اگر علم کے حصول کی لگن ہو تو گھریلو و معاشی معاملات ترکِ تعلیم کا سبب ہرگز نہیں بن سکتے، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی عدم دلچسپی کو الجھے ہوئے گھریلو معاملات کے پردے سے چھپا کر خود کو مطمئن کرلیں۔

ٹیچرس ڈے

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرہ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر۔

استاد وہ جو خرد Rationality کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا سکے۔ جو مخلوقات creation پر غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ساتھ خالق creator کا پتہ دے۔ جو طلبہ کو دماغ سے دل اور جنوں کی طرف کھینچ لائے۔ جو اندر عشیر تک الاقربین کی دہائی دیتا ہوا طلبہ کو جھنم کی آگ سے بچا نکالے۔ جس کی کوششوں کا محور و مرکز طلبہ کو ایسی جماعت میں شامل کرنا ہو جسے نہ کوئی خوف ہوگا اور اور نہ ہی غم۔

اور اس بات کی دہائی دیتا ہوا اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے کہ۔

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

استادِ محترم پروفسر جمیل آمل سر

پروفسر شیخ خدیجہ چکتے

"شاعروں سے تعلق رکھو، طبعیت ٹھیک رہے گی، صاحب یہ وہ حکیم ہیں جو لفظوں سے علاج کرتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفسر جمیل کامل ایک برجستہ شاعر کے روپ میں جانے جاتے ہیں۔ جمیل سر میرے استادِ محترم ہیں اس لیے مجھے انہیں قریب سے جاننے کا موقع ملا ہے۔

مرحوم پروفسر انور ظہیر سر کے وہ الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں جو انہوں نے جمیل سر کے لیے کہے تھے۔

انھوں نے مجھ سے کہا تھا" خدیجہ! تم جانتی ہو جمیل کامل ایک 'خالص شاعر' ہے۔ جس کی شاعری جان دار ہے جسے کوئی ایک بار سن لے تو اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے یہ ایک ایسا شاعر ہے جیسے سگریٹ نوشی کا شوق نہیں ہے، جسے شراب نوشی کا شوق نہیں، جس کے اندر کوئی غلط فعل نہیں، صرف ایک بات کو چھوڑ کر- آج کے جدید دور کا یہ پہلا شاعر ہے جو پانچ وقتوں کی نماز پابندی سے ادا کرتا ہے، ورنہ شاعروں کی جماعت تو دل پھینک عاشق ہوتی ہے۔"

بڑی حد تک مرحوم انور ظہیر سر کے الفاظ درست ثابت ہوئے ہیں۔

اگر اسٹیج کو کنٹرول کروانا ہو تو نظامت کی ذمہ داری جمیل سر کے سپرد کر دیجیے پھر دیکھیے کمپیوٹر کی طرح جو شخصیت جس مزاج کی حامل ہے اس پر اسی انداز کے اشعار کی بوچھار شروع ہو جائے گی۔

ان کا ہاتھوں کو ہوا میں لہرانا، سامنے رکھے ڈائس کو زور سے بجانا، آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں. جب جمیل سر نظامت کر رہے ہوں اور کسی کی توجہ اُن کی طرف نہ ہو تو وہ اسے اپنے طرف متوجہ کرنے کے لیے شعروں کی بارش شروع کر دیں گے۔

آج کل آپ جو خاموش رہا کرتے ہیں — سب اسے پیار کے آثار کہا کرتے ہیں

برہمی ان کی ادا، نرمی ہے اپنا شیوا — وہ سنیں یا نہ سنیں، ہم تو کہا کرتے ہیں

یقین مانیے سارے حال میں خاموشی چھا جاتی ہے۔

ان کا ایک گیت جو مجھے بے حد پسند ہے:

گم صم گم صم کیوں بیٹھے ہو بولو نا کیا بات ہوئی — کیا تم نے بھی عشق کیا ہے، کیا تم کو بھی مات ہوئی

سر اس گیت کو مدہوش ہو کر جب گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا کہ سب کی خواہش ہوتی گیت چلتا رہے اور کبھی ختم نہ ہو، سر اس کو بار بار گاتے رہیں۔

دوپہر کے کھانے کا ٹفن اکثر ان کے ساتھ رہتا، سادہ کھانا اور دو گھونٹ چائے کی چسکی ان کے لے کافی ہوا کرتی تھی۔ کھانے میں اکثر وہ لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کرتے تھے۔ "آؤ! بسم اللہ کرتے ہیں۔ "ایک دن کسی ساتھی نے کہا" کیا ہے کھانے میں، ٹفن تو خالی لگ رہا ہے؟" سر نے مسکراتے ہوئے کہا:

"خالی برتن ہی تو ٹھن ٹھن کی صدا دیتے ہیں۔"

کسی عارف سے تعارف نہ کرانا کامل　　آدمی کیسا ہے انداز بتا دیتے ہیں۔

کھانے میں کبھی کھجور روٹی، کبھی کدّو کی ترکاری، کبھی آملیٹ، کبھی جیلی اور کبھی سیب، روٹی۔

کسی نے ان سے ان کا حال پوچھ لیا تو سر کا جواب ہوتا:

حالِ دل بیان کیا کریں　　کٹ گئی زبان کیا کریں

زخمِ دل بھر گیا ہے مگر　　رہ گئے ہیں نشان کیا کریں

اکثر میں نے دیکھا کہ جب جھومتے ہوئے، کسی شعر کو گنگناتے ہوئے اسٹاف روم میں داخل ہوتے اور اگر چائے والے پر نظر پڑ گئی تو نعرہ بلند کرتے: "اسٹاف روم میں جو بھی ہیں سب کو چائے پلاؤ" اور خود دو گھونٹ لیکر جیسے لہراتے ہوئے آئے تھے ویسے لہراتے ہوئے نکل جاتے۔ دوسرے دن چائے والا جب اپنے روپے مانگتا تو سر اس سے ناراض ہوتے ہوئے کہتے: "کس کم بخت نے چائے پی ہے؟ میں تو اب آرہا ہوں۔" وہ کہتا: "سر آپ نیکل سب کو چائے پلانے کے لے کہا تھا، میں نے پلادی۔" سر کو کل کی بات یاد آئی۔ مسکرا کے بولے "ہم نے کہا، تو تم نے پلائی کیوں؟ اور پینے والوں نے پی کیوں؟ کالج آتے ہی جیب کٹ گئی۔۔!" پھر مسکراتے ہوئے جیب سے روپے نکال کر اسے دے دیتے اور کہتے باقی پیسے تم رکھ لو!"

کالج میں اکثر لوگوں کو ان سے شکایت رہتی تھی کہ جمیل کامل اکیلے نہیں آتے ہیں جب بھی آتے ہیں راجے مہاراجے کی طرح ان کے ساتھ دس بارہ لوگ چلتے ہیں۔ اپنا مجمع ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اکثر اسٹاف روم میں ان کے چاہنے والے ان کا انتظار کرتے ہوئے پائے جاتے۔ اکثر کسی اسٹاف ممبر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ملتے اور لوگ اپنی ناراضگی کی شکایت پرنسپل صاحب سے کر دیتے تھے یا انھیں سے کہتے کہ یہ آپ کا پرسنل چیمبر نہیں ہے جو آپ کسی کو بھی ملنے بلاتے ہیں۔ سر لوگوں کے غصے اور ناراضگی کا اپنے انداز میں جواب دیتے:

کوئی تو ایسا میت ملے ہم جس سے دل کی بات کریں　　یاں جعفر صادق ہی نہ ہوں جو موقع پا کر گھات کریں

دُکھائے دل جو کوئی اس کو بھی دعا اے دل　　خلوص سے دلِ کامل کوئی دکھائے بہت

جب محبت سے لوگ ملتے ہیں　　سو طرح پھول بن میں کھلتے ہیں

پیار کے بول ہوں اگر کامل　　دل کے سب زخم یوں ہی سلتے ہیں

جمیل سر بالکل مختلف شخصیت کے مالک ہیں۔ لوگ کچھ بھی کہیں، انھوں نے کبھی کسی کی بات کو دل پر نہیں لیا۔ ہاں شعروں کی بارش میں اپنے دل کی بات کہہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا زبردست طنز ہوتا کہ مخاطب لاجواب ہو جاتا بلکہ طنز کے کاری وار سے لہولہان ہو جاتا یا کہیے چاروں خانے چت ہو جاتا۔ جمیل سر کی شاعری کی بات ہی کیا.....واہ واہ

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس شعر کی کہانی یوں ہے کسی خوب صورت بنگلے کے خوب صورت باغیچے میں ایک بہت ہی خوب صورت پھول تھا۔ اب وہ پھول بوڑھا ہو چلا تھا مگر اتنے دنوں سے اپنی تعریفیں سن سن کر اس میں ایک عجب رعونت بلکہ اکڑ آگئی تھی۔ خود پسندی کے زعم میں کیا اپنے کیا پرائے سب کو بہ نظر تحقیر دیکھتا تھا۔ اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھا ہو چلا ہے تو کچھ فکر آخرت بھی کر لے، دل آزاری کا شیوہ ترک کر لے۔ ایک دن اسی ذہنی خناس کے زیر اثر ایک معصوم کلی کو زبردست پھٹکار سنائی۔ کلی بے چارہ اپنی انسلٹ پر زار و زار رونے لگی۔ اس کا رونا نہ تھمتا تھا۔ حسن اتفاق سے میں (اسے بنگلے کا مالک نہ سمجھیں) وہاں پہنچا۔ کلی کی بے بسی اور اس کا پھپھکنا دیکھا نہ جاتا تھا۔ باغیچے میں ہر ایک اس کا ہم درد تھا لیکن اظہار کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ میں نے کلی کو تسلی دیتے ہوئے کہا کیوں غم کرتی ہو، یہ بڈھا کھوسٹ اور کتنے دن جیے گا۔ میری یہ بات سن کر کلی بے ساختہ مسکرانے لگی۔ حاصل کلام یہ کہ تسلی کے وقت ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن سے فوراً مداوائے غم ہو۔

ممبئی میں اردو ڈرامے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

(موضوعِ تحقیق برائے پی ایچ ڈی۔سینٹر: مہاراشٹر کالج ممبئی)

پروفیسر آصف شیخ

انسان کی زندگی میں ادب کی بڑی اہمیت ہے ادب کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں یہاں زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ بامعنی اور بااصول زندگی گزارنا ہے۔ادب کی اہمیت وافادیت اسی وقت قایم رہ سکتی ہے جب ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادبا وشعرا نے مختلف اصناف ادب سے زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔اصلاح معاشرہ کے لیے ادیبوں نے مختلف اصناف سخن کا سہارا لیا تا کہ زندگی کو مزید سنوارا جائے میرے نزدیک ڈراما ایک ایسی ہی صنف ہے کہ جس سے معاشرہ کی خاطر خواہ اصلاح کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کام کے لیے صرف تحریر اور تقریر سے کام نہیں چلتا بلکہ عمل کی بھی اشد ضرورت ہے اسی لیے اردو ادب میں ڈراما ہی ایک واحد صنف ہے جس میں کرداروں کے ذریعے عمل کر کے دکھایا جاتا ہے۔

ڈراما کا موجد ملکِ یونان ہے۔ڈراما یونانی زبان کے لفظ ''ڈراو'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے عمل یعنی کر کے دکھانا ویسے تو اردو نثری ادب کی سب سے قدیم صنف داستان ہے،چوں کہ داستان بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ساتھ قصہ در قصہ تکنیک میں لکھی جاتی ہے اس لیے یہ طویل ہوتی ہے۔اسی طرح ڈرامے میں بھی کہانیاں ہوتی ہیں لیکن ہر ڈراما ایک ہی کہانی پر مبنی ہوتا ہے۔داستان کو ہم سن سکتے ہیں لیکن ڈرامے میں یہ ممکن نہیں اسی لیے کرداروں کے ذریعے اسے عملاً ترتیب دیا جاتا ہے۔عام طور پر اردو ادب میں ڈرامے کا کوئی مخصوص مقام متعین نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی مستند تاریخ نہیں ملتی ہے۔اگر ہم ڈرامے کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں صرف دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے ایک محمد عمر نور الہی صاحبان کی ''ناٹک ساگر'' اور دوسری بادشاہ حسین کی ''اردو ڈراما کی تاریخ'' ہے۔اس کتاب سے ہمیں ڈراما نگاری،اسٹیج اور تھیٹر وغیرہ کے متعلق اہم معلومات ملتی ہیں۔

کسی بھی ادبی تخلیق کو صنف کا درجہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول وقواعد مرتب کیے جائیں۔ابتداء میں ارسطو نے بھی ڈرامے کے چھ عناصر قائم کیے تھے۔(۱) کہانی (۲) کردار (۳) الفاظ (۴) خیال (۵) آرائش اور (۶) موسیقی۔جیسے جیسے ڈراما ترقی کرتا گیا زمانے کے ساتھ ساتھ اس کے عناصر و اجزائے ترکیبی میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔عام طور پر آج کل جو ڈرامے لکھے یا اسٹیج کیے جاتے ہیں ان میں درج ذیل اجزا یا عناصر ترکیبی کا ہونا لازمی ہے۔(۱) پلاٹ (۲) کہانی یا مرکزی خیال (۳) آغاز (۴) کردار،سیرت نگاری (۵) مکالمہ (۶) تسلسل،کشمکش اور تذبذب (۷) تصادم (۸) نقطۂ عروج (۹) انجام

ہندوستان میں اردو ڈراما کی ابتدا باقاعدہ طور پر نواب واجد علی شاہ کے دور سے ہوتی ہے۔اب اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں اردو کا پہلا اسٹیج ڈراما کون سا تھا؟اس تعلق سے مختلف محققین نے مختلف ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔مسعود حسن رضوی ادیب کی تخلیق کے مطابق اردو کا پہلا ڈراما ''رادھا کنہیا'' کا قصہ ہے جو ۱۸۴۳ء میں لکھنو کے شاہی محل کے اسٹیج پر کھیلا گیا جیسا کہ اوپر اردو کے پہلے ڈرامے کا ذکر ہو چکا ہے کہ جسے لاکھوں روپے کی لاگت سے اسٹیج کیا گیا اس کے بعد واجد علی شاہ نے ہی اپنی عشقیہ مثنویوں،دریائے عشق،افسانہ عشق اور بحر الفت کو ناٹک کی صورت میں اسٹیج پر پیش کیا۔ڈراما کا حق اس وقت تک ادا نہیں کیا جاسکتا یا یہ کہہ لیجیے ڈراما اُس وقت تک مکمل و کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اسے اسٹیج پر نا کھیلا جائے شروع شروع میں جب تھیٹر کا تصور بھی نہیں تھا اس وقت

ڈراما اسٹیج پر کیا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، ڈراما کے لوازمات و وسائل کی سہولت مہیا ہوتی گئی تو ڈراما نے اپنا رخ اسٹیج سے تھیٹر کی جانب کیا۔ ڈراما اور تھیٹر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزم ہیں کیونکہ صرف صفحہ قرطاس پر مکالموں کو رقم کر کے ہم ڈرامے کے مقصد کو پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ اسے اسٹیج یا تھیٹر میں اداکاروں کے ذریعے پیش نہ کریں۔

ممبئی میں اردو ڈرامے کے آغاز کی بات کی جائے تو یہ اس وقت شروع ہو چکا تھا جب لکھنو کے مضافات میں ''اندر سبھا'' داد وصول کر رہا تھا۔ اسی برس ممبئی میں ایک اسٹیج پر 'اندر سبھا' کو منظوم شکل میں پیش کیا گیا۔ جب اندر سبھا ممبئی پہنچا اس وقت ممبئی میں کم و بیش انیس تھیٹریکل کمپنیاں قایم ہو چکی تھیں۔ ان تمام تھیٹریکل کمپنیوں میں زیادہ تر اردو ڈرامے پیش کیے جاتے تھے اور ان کے لکھنے والے بھی غالباً پارسی ہوا کرتے تھے۔ ۱۷۵۰ء میں ممبئی میں انگریزی تھیٹر کی تعمیر عمل میں آچکی تھی جو آگے چل کر ممبئی تھیٹر کے نام سے مشہور ہوا۔ شروع شروع میں اسے وکٹوریہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ۱۸۴۵ء میں اس کی از سر نو تعمیر کی گئی اور ''نیو ممبئی تھیٹر'' کا نام دیا گیا۔ اس تھیٹر کے شروعاتی دور میں انگریزی اور مراٹھی ڈرامے پیش کئے جاتے رہے اور ان ہی سے متاثر ہو کر اردو داں طبقے نے بھی اردو ڈراما اسٹیج کرنے کی کوشش شروع کر دی اور اس طرح ممبئی میں اردو اسٹیج ڈراموں کا ایک دور شروع ہو گیا اور زیادہ تر اردو ڈرامے پارسیوں کے تھیٹر میں ہوا کرتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں ''پارسی ڈریمٹک کور'' نامی کمپنی نے ''پیدائش سیاؤس'' نامی دو حصوں میں اردو ڈراما پیش کیا اور پھر اسی سال مزید دو اور ڈرامے ۱) حاجی میاں فضل اور کلال خانہ ۲) پٹھان سرفراز اور گل'' پیش کئے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اردو ڈراموں کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

ممبئی میں اردو اسٹیج اور ڈراما جن لوگوں کی بدولت عروج کو پہنچا اگر ان کا مختصراً ذکر نہ ہو تو یہ ناانصافی ہوگی۔ جن میں مرزا محمد کاظم افسوں اور مراد آبادی ہیں جنھوں نے ممبئی تھیٹریکل کمپنی کے لیے کئی ڈرامے لکھے مثلاً (۱) خوش رو حسینہ عرف الفت کا نگینہ (۲) دلیر و شیر عرف چوری و سینہ زوری ان کے علاوہ منشی رونق، طالب بنارسی، حسینی میاں ظریف، محمد عبداللہ، مرزا نظیر بیگ، نذر محمد فتح علی عبدالطیف شاد اور بالخصوص آغا حشر کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ درج بالا ڈرامہ نگاروں کے علاوہ کئی اور ایسے ڈراما نگار ہیں جنھوں نے اپنی ان تھک کاوشوں اردو ڈراما اور پارسی اسٹیج کو بام عروج پر پہنچایا جس کی بدولت پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکان نے خوب منافع کمایا چوں کہ پارسی تھیٹر مالکوں کا مقصد اردو اسٹیج ڈراموں کے ذریعے پیسے کمانا اور تفریحی سامان مہیا کرنا تھا اس لیے انھوں نے ڈراموں کے معاشراتی، اصلاحی اور ادبی پہلوؤں کو کر دیا جس کی بدولت ایک وقت کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ بقول پروفیسر احتشام حسین۔

''ان ڈراموں میں ہندوستانی زندگی اور سماجی کش مکش سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جن تھیٹروں میں یہ ڈرامے دکھائے جاتے تھے ان کی قومی یا تہذیبی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہ صرف نئے تجارتی مرکزوں کی تفریح گاہ تھے شاید کسی بڑے ادیب نے اس صنف ادب سے کوئی دل چسپی نہیں لی''

ممبئی میں اردو ڈراموں کے ارتقاء اور فروغ میں 'اپٹا' (Inidan People's Theater association) نے اہم رول ادا کیا۔ ترقی پسند تحریق کے دوران اس کے قیام کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت کے ہندوستان کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ فاشسٹ قوتیں سر چڑھ کر بول رہی تھیں ایسے حالات میں عوام الناس کو حقیقت سے روشناس کرنے اور امن و بیداری کا پیغام پہنچانے کے لیے ترقی پسند تحریک وجود میں آئی۔ ۱۹۳۹ء میں شیو دان سنگھ چوہان نے ترقی پسند تحریک کے ایک جلسہ میں اپنا مضمون '' بھارت کی جن ناٹیہ شالہ'' پیش کیا جس میں انھوں نے یورپ کے یونیورسٹی کی طرز پر ایک عوامی تھیٹر قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں سنہالی خاتون انیل ڈی سلوا نے چند لوگوں کے ہمراہ ممبئی میں اپٹا کی یونٹ قایم کی اور اس یونٹ نے یکم مئی ۱۹۴۲ء کو ممبئی کی مزدور بستی پریل کے دامودر ہال میں اپنا عوامی تھیٹر شو پیش کیا جس میں ''سرمالکر'' کا مراٹھی ڈراما ''دادا'' اور سردار جعفری کا مشہور ڈراما ''یہ کس کا خون ہے'' پیش کئے گئے جو کافی مقبول ہوئے۔ علی سردار جعفری کا ڈرامہ ''یہ کس کا خون ہے؟'' چٹ گاؤں پر جاپانی بم باری اور فاشزم کے خلاف تھا۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ ممبئی میں اپٹا کا قیام عمل میں آیا جس کی پہلی سکریٹری انیل ڈی سلوا ہی تھیں۔

لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہو گئے

پروفیسر آصف شیخ

تقریباً پچھلے دو سالوں سے پوری دنیا ایک مہلک وبا سے دو چار ہے اور اس وبا کی وجہ سے لوگوں کی زندگی موت کے دہانے پر پہنچ گئی پیشہ ور افراد بے روزگار ہو گئے، ملازمت کرنے والے اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، شاپنگ مال و بازار سب کے سب سنسان ہو گئے، سڑکیں گاڑیوں سے خالی ہو گئیں، غریب مزدور فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے لیکن ایک جگہ ایسی بھی تھی جہاں لوگوں کا ازدہام تھا اور وہ جگہ تھی ہسپتال۔ جہاں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں مریض لائے جا رہے تھے لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب ہسپتالوں کے باہر بھی ہاؤس فل کی تختی آویزاں ہو گئی۔

حکومتیں اس وبا کو قابو کرنے سے قاصر تھی اس لیے ہر روز بیماری سے بچنے کے مختلف اصول ترتیب دیے جا رہے تھے۔ حکومت کی ہدایت کے مطابق تمام تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیز کو بند کر دیا گیا تھا تمام سرکاری، نیم سرکاری اور نجی دفاتر کو بند کر کے گھر سے کام کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ شہر میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی تھی اس کی رو سے گلی محلوں سڑکوں یا چوک پر دو سے زیادہ افراد کے جمع ہونے پر پابندی عائد تھی۔ دن اور رات کا کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا اگر ایسے میں کوئی گھر سے باہر نکلتا تو پولیس اس کا استقبال لاٹھی اور ڈنڈوں سے کرتی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی کئی ایسی چیزیں تھی جو آن لائن جاری تھی جس سے لوگ اپنا وقت گزار لیا کرتے تھے مثلاً تعلیم، سیمنار، حفظان صحت کے متعلق تقریریں، شعری نشستیں، مشاعرے، تقریبِ کتب رونمائی اور شادیاں وغیرہ۔ یہاں تک کہ اخبارات بھی آن لائن ہی پڑھنے کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ لوگوں کی بڑی تعداد اس دوران گھر پر ہی آرام کر رہی تھی اور یہ وہ آرام تھا کہ جس میں سکون نام کو بھی نہ تھا کچھ لوگوں نے اس فرصت کے اوقات کو نعمت جان کر اس سے استفادہ کیا اور کچھ نے اس وقت غنیمت کو ضائع کر دیا ان تمام ضائع کرنے والوں میں خاکسار بھی شامل ہے۔ یوں تو میں خود کو اردو کا ایک ادنیٰ سا طالب علم مانتا ہوں ہوں اور بحیثیت طالب علم اردو سے متعلق و منسوب ہر محفل و تقریب میں حاضر ہونا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

اس طرح اردو کی آن لائن محفلوں اور تقاریب میں شامل ہو کر میں بھی کسی حد تک اردو کا حق ادا کرنے لگا۔ اردو شعری نشستیں اور کتب رونمائی کی محفلوں میں شریک ہو کر سوچتا کہ کیوں نہ میں بھی کچھ ایسا کارنامہ انجام دوں کہ جس سے مجھے بھی رونق اسٹیج ہونے کا موقع ملے، مجھے بھی انعامات و اعزازات سے نوازا جائے، اخیر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کیوں نہ صاحب کتاب کا لقب ہی حاصل کر لیا جائے۔ میں نے اساتذہ سے سن رکھا تھا کہ ایک صفحہ لکھنے کے لئے سو صفحات کا مطالعہ ضروری ہے اب میں تذبذب کا شکار تھا کہ آیا روزانہ سو صفحات کا مطالعہ کیسے ممکن ہے کیا وہ شعراء و ادباء جن کی ہر ماہ، دو ماہ میں کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کا مطالعہ اتنا وسیع ہوتا ہے یا پھر کوئی جگاڑ۔ اردو کے ایک ادنیٰ طالب علم کے لیے روزانہ سو صفحات کا مطالعہ کرنا اور صاحب کتاب کا ٹائٹل حاصل کرنا جو ※ شیر لانے کے مترادف تھا پھر کیا تھا دماغ پر ایک دھن سوار ہو گئی۔ میں ہر ادبی محفل و بزم میں لوگوں سے اس طرح ملتا جیسے میں کوئی ادیب یا شاعر ہوں۔ ہر ادبی محفل یا تقریب میں، میں اپنے ہمراہ ایک آدھ بے روزگار دوست اور ایک تھیلی میں کچھ پرانے اور کچھ نئے ادیبوں کی کتابیں ضرور ساتھ رکھتا تا کہ لوگوں کی خوش گمانی بنی رہے۔ میں نے اپنے تمام ملنے جلنے والے دوست احباب و اساتذہ سے صلاح و مشورہ کیا لیکن سب نے میری فطرت کو سمجھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں کسی جگاڑ کے ذریعے یہ لقب حاصل کر لوں۔ دماغ تو اس پر آمادہ تھا پر دل نہیں اس طرح دل و دماغ کی تکرار میں، دل نے بازی ماری اور پھر یہ طے پایا کہ کچھ بھی ہو جائے صراط مستقیم پر ہی چل کر کتاب ترتیب دی جائے گی۔

کتاب لانے کے لیے رقم کی بھی ضرورت درکار تھی ایک طالب علم کے لیے یہ بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ لوگوں سے ملاقات کے دوران ایک مشفق استاد نے مجھے مشورہ دیا کہ" اردو اخبار میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے مسودات پر مالی تعاون فراہم کرنے کا اشتہار آیا ہے۔ تم بھی کچھ لکھ کر فوراً ایک

کاپی اکیڈمی کے دفتر جمع کرآوان شاء اللہ تمہیں بھی کچھ رقم موصول ہو جائے گی"۔سر کی بات سن کر میں مسرت سے جھوم اٹھا اور اپنے طالب علمی کے زمانے میں اور مختلف ادبی محفلوں میں شرکت کے بعد ترغیب پا کر جو کچھ بھی لکھا تھا اسے ایک ماہ کی کڑی مشقت کے بعد خود ٹائپ کر کے 60 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ کا مسودہ تیار کرلیا۔سر نے مجھ سے کہا تھا کہ جب بھی مسودہ دفتر پہنچانا تو میرا بھی لے جانا کیوں کہ میں بھی اس اشتہار سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں اس طرح میرے مسودے کے ساتھ دو اور مسودے تیار تھے جس میں ہمارے ایک عزیز کا بھی مسودہ شامل تھا۔میرے مضامین طنز و مزاح پر مبنی تھے اور تعداد میں کم اسی لیے میری کتاب کی ضخامت بھی کم تھی لیکن ہمارے دوست جن کی کتاب اب *فلسطینی کہانیوں* کا ترجمہ تھی تھی اور سر کی کتاب جو *سود* کے موضوع پر تھی کافی ضخیم تھی۔پھر کیا تھا ہم دونوں حضرات اپنا اور سر کا مسودہ لے کر مقررہ وقت پر اکیڈمی کے دفتر پہنچ گئے اور مسودوں کی ایک کاپی کے ساتھ ساتھ ضروری فارم بھر کر جیسے ہی جانے لگے تو وہاں بیٹھے ایک شخص نے کہا کہ آپ چاہیں تو یہاں سے کچھ کتابیں لے جاسکتے ہیں۔کتاب مفت میں لے جانے کی بات سن کر میں بڑا خوش ہوا اور دو تین کتابیں الماریوں سے ٹٹول ٹٹول کر اٹھالی ویسے بھی ہم اردو والوں کا کتاب خرید کر پڑھنا کسی سائل کو صدقہ وخیرات دینے کے مترادف ہے۔تبھی تو یہاں کتابیں مفت تقسیم کی جارہی ہیں لیکن لینے والا ندارد نہ جانے یہ کتابیں کتنے سالوں سے یہاں دھول میں اٹی ہوئی ہیں۔اکیڈمی والے بھی سوچتے ہوں گے کہ کتابوں کی مفت تقسیم سے دھول کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی کم ہو جائیں گی۔اسی تعلق سے ایک اشتہار میں نے بھی اخبار میں پڑھا کہ جن اسکول و مدارس کو اپنی لائبریری کے لیے کتابیں درکار ہیں وہ یہاں سے کچھ کتابیں لے جاسکتے ہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہی لوگ وہاں گئے ہوں گے کہ جن کی لائبریریوں کی الماریاں کتابوں سے خالی ہوں گی۔اتنی سخاوت اور دریادلی کے بعد بھی علم کا خزانہ جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔

بہرکیف ہم دونوں کچھ کتابیں لے کر کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور مسودوں پر ملنے والی رقم کا انتظار کرنے لگے۔کیا پتا کتنے لوگوں نے مسودوں کی کاپیاں جمع کی ہوں گی۔ہمارے یہاں پر لکھنے والوں کی کمی ہے کیا ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اُن کا لکھا ہوا سوائے اُن کے کوئی نہیں پڑھتا۔بیچارہ مصنف بھی اپنی کتاب چھپوا کر دوبارہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ہاں لیکن صاحب کتاب بننے کی جو خوشی اسے محسوس ہوتی ہے اسے تصور میں بھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔یہ تمام باتیں سوچ کر میں بھی اس تصور کا احساس کرنا چاہتا تھا اور بڑی شدت سے اکیڈمی کے مالی تعاون کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک حکومت کی جانب سے کرونا وائرس کے چلتے تالا بندی کا اعلان کر دیا گیا 2019ء میں ہم لوگوں نے اکیڈمی میں مسودے جمع کروائے تھے لیکن یہ پورا سال کرونا کی نذر ہوگیا اور میں نے بھی مفت میں کتاب چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا میری خواہش حسرت میں تبدیل ہوگئی۔

کچھ مہینے گزرے تھے کہ اچانک میرے واٹس ایپ پر اکیڈمی سے ایک افسر کا پیغام آیا کہ" آپ کو اکیڈمی کی جانب سے مسودے پر آٹھ ہزار کی رقم ادا کی گئی ہے اور آپ کو چھ ماہ کے اندر اپنی کتاب شائع کروا کر اس کی پانچ کاپیاں اکیڈمی میں جمع کروانی ہوگی"۔میں فوراً اپنے فون کے میسج اِنباکس میں گیا تو وہاں آٹھ ہزار روپے اکاؤنٹ میں جمع کر دیئے گئے،کا میسج تھا دیکھ کر میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا مجھے یقین نہیں تھا کہ میرے مسودے کو اکیڈمی قبول کرے گی کیوں کہ میرے مضامین ہلکے پھلکے اور روزمرہ کے تجربات پر مبنی تھے۔میں نے فوراً اپنے دوست کو یہ معلوم کرنے کے لئے فون ملایا کہ انہیں بھی اس قسم کا کوئی پیغام موصول ہوا یا نہیں میرا فون اٹھاتے ہی انہوں نے بھی مجھ سے میسج کے متعلق سوال کیا پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرنے لگے۔

میں یہ خوش خبر سر کو دینے کے لیے فون کیا یا تو انہوں نے بھی کہا کہ مجھے بھی رقم موصول ہوئی ہے۔جب انہوں نے میرے متعلق پوچھا تو میں نے بھی کہہ دیا کہ" سر میں آپ کی مبارکباد کا منتظر ہوں" یہ سن کر انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور مبارکباد پیش کی۔ہم تینوں میں، میں سب سے زیادہ خوش تھا کیوں کہ یہ میری پہلی کتاب تھی جو مفت شائع ہونے والی تھی، ورنہ لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے صاحب کتاب بنتے ہیں اور آدھی سے زیادہ کتابیں اپنی ذاتی لائبریری یا پھر دوستوں کو ہدیہ دینے میں صرف کر دیتے ہیں۔خیر میں وہ سارا دن خود ہی لوگوں کو فون کر کر کے مبارک بادیاں قبول کرتا رہا۔ایک صاحب

نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کتاب کا نام کیا ہے؟ چوں کہ اتنے مہینے گزر چکے تھے اور اچانک پیسے ملنے کی خوشی میں، میں کتاب کا نام بھی بھول گیا تھا، جب میں نے یہ بات انہیں بتائی تو وہ بھی ہنسنے لگے اور کہا کہ جب تمہیں یاد آجائے تو مجھے بھی بتا دینا۔ پھر میں نے اس مسودے کی تلاش کی جس کی ایک کاپی میرے پاس تھی۔ ایک گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد وہ مسودہ ہاتھ لگا جس پر عنوان تھا* پیچ وتاب *

اب میرا پیچ وتاپ بڑھتا گیا کہ رقم تو میں نے لے لی اب اسے کس طرح اور کہاں سے شائع کیا جائے۔ پھر ہم تینوں ایک دوسرے سے صلاح مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ جو پبلیشر ہمیں آئی ایس بی این نمبر فراہم کرے گا ہم اپنی کتاب اسی سے چھپوائیں گے وہ اس لئے کہ اس نمبر کی وجہ سے کتاب کی اہمیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پھر ہم مختلف لوگوں سے تینوں کتابوں کو چھپانے کے لئے کوٹیشن منگوانے لگے ہمارے دوست نے کہا کہ وہ ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جو کتابیں شائع کرتے ہیں اور ان کا ایک چینل بھی ہے لیکن میں نے کبھی کیبل ٹی وی پر ان کا چینل نہیں دیکھا۔ خیر جب ان سے کوٹیشن منگوایا گیا تو اس کے مطابق مجھے میری کتاب کی اشاعت پر 12000 روپے خرچ کرنے تھے۔ میں کسی اور کوٹیشن کا منتظر تھا لیکن سر نے کہا کہ بھئی یہ آپ کے دوست کے دوست ہیں اور ان کے کہنے کے مطابق ایک معتبر شخص ہیں اور قریب ہی رہتے ہیں اگر کچھ مسئلہ درپیش ہوا تو ہم ان کے پاس جا کر فوراً حل کر سکتے ہیں ورنہ ممبئی سے باہر چھپوانے میں کتاب پر خرچ بھی زیادہ ہوگا، تاخیر بھی ہوگی اور پبلشر کے غیر ضروری عذر کو بھی قبول کرنا ہوگا۔ پھر میں نے کہا کہ میں اکیڈمی کی رقم سے مزید خرچ برداشت نہیں کر سکتا اس لئے میں چاہوں گا کہ آٹھ ہزار میں جتنی بھی کاپیاں آجائے مجھے منظور ہے۔

پھر ہم تینوں نے ان صاحب سے رابطہ کر کے اپنی آدھی سے زیادہ رقم ان کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ اگر کتاب کا مسودہ تیار ہے اور با ترتیب ہے تو پھر سرِ ورق کے لئے زیادہ سے زیادہ دو یا تین دن درکار ہوتے ہیں پھر اس کے بعد کتاب چھاپنے اور بائنڈنگ کے لیے ہفتہ یعنی آپ کی کتاب ہفتہ دس دن میں تیار ہو جاتی ہے۔ تقریباً پانچ مہینے مکمل ہونے والے ہیں اور ہماری ساری کتابوں کے سرورق کا کچھ اتا پتا ہی نہیں۔ میں نے 5 اپریل 2019 کو اپنی رقم منتقل کی لیکن ابھی تک میری کتاب کے سرِ ورق کا سوراخ بھی نہیں ملا ہے۔ تین ماہ قبل رابطہ کرنے پر پتہ چلا کہ تالہ بندی کے چلتے وہ اپنے وطن عزیز میں مقیم ہیں پھر اس کے بعد ہمارے اور ان کے درمیان پیغامات کے تبادلے ہوتے رہے پھر کال کے دھیرے دھیرے تبادلے یک طرفہ ہو گئے اور اب ایک طویل خاموشی ہے نہ اب کسی پیغام کا جواب آتا ہے اور نہ کال کا پہلے میں ہی* پیچ وتاب * میں تھا اب ہم تینوں ہیں۔

چھ ماہ کی مدت ختم ہونے کو کچھ ہی دن رہ گئے ہیں اب ہم تینوں کے ذریعے مختلف کوششیں اور منصوبہ بندی جاری ہے کہ اُن صاحب سے کس طرح رابطہ کیا جائے شروع میں جس طرح سے انہوں نے پیغامات اور فون پر وعدے کیے تھے وہ سب بے سود نکلے۔ موصوف کے قول وفعل میں تضاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تو سر نے مجھ سے کہا بھی کہ آپ بذات خود ان سے بالمشافہ ملاقات کیجئے اور کہیں کہ ہمیں اب بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ہمارے پیسے لوٹا دیجئے ہم کسی اور معتبر شخص کو ڈھونڈ لیں گے۔ جب میں ان کے دفتر پہنچا تو انہوں نے پھر عادتاً ایک مصروفیت کا عذر پیش کر دیا اور اپنا واٹس ایپ کا پیغام مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ میں نے ابھی سر کو میسج کیا کہ چار سے پانچ دنوں میں آپ تینوں کی کتابوں کا سرِ ورق مکمل کر لیا جائے گا۔ ان چار، پانچ دنوں کو گزرے ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں لیکن اب بھی کوئی خبر نہیں۔

پہلے میں سمجھتا تھا کہ کتاب کے لئے مواد تیار کرنا یا مضامین لکھنا ایک بڑا مسئلہ ہے لیکن اب پتا چلا کہ مواد سے لے کر کتاب کے سرِ ورق کو آخری شکل دینے تک تمام مراحل بڑے دشوار ہیں اور وہ بھی اس وقت جب آپ کا سابقہ کسی معتبر شخص سے پڑ جائے۔ میری آپ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میری کتاب کے لیے دعا کریں تا کہ وہ جلد از جلد منظر عام پر آئے اور میں بھی سب سے یہ کہہ سکوں کہ

لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہو گئے

بچوں میں بے راہ روی کا بڑھتا رجحان وجوہات اور سدِّ باب

پروفیسر خان تسنیم کوثر مبارک حسین

ہم اور آپ سبھی نے اپنے اطراف جائزہ لیا ہوگا آج کل کے ماحول میں بچے کس طرح پرورش پا رہے ہیں. اور کس ڈھنگ سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں، کہیں والدین کو دھوکے میں رکھ کر تو کہیں بیوقوف بنا کر غلط راستوں کی طرف چل نکلے ہیں بچے منشیات کے عادی ہیں، غلط صحبتوں میں پڑنے کے باعث گالی گلوج غنڈہ گردی کے ماحول میں بھی شامل ہیں. اس کے علاوہ تعلیم سے کوسوں دور بھی یہ تمام وجوہات ہمارے معاشرے اور ملک کی ترقی میں بھی رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں. ہمیں ایک ذمہ دار فعال شہری ہو کر ان زاویوں پر غور کرنا ہوگا کہ آخر یہ برائیاں اور یہ بچوں کی بے راہ روی کہاں سے جنم لے رہی ہے آخر اس کا سد باب کیا ہے کونسی کمیاں ہمارے ملک کے مستقبل کے ان غنچوں کو نقصان پہنچا رہی ہیں. ایک مشاہدہ کے بعد سب سے پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں متوسط گھرانوں کی تعداد زیادہ ہے اور پھر وہ غرباء جن کا تعلق نچلے طبقے سے ہے جہاں ان کی تنگدستی معاشی کمیوں کو پورا کرنے میں انہیں روزگار میں مشغول رکھتی ہے تاکہ وہ اپنی بنیادی اور روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرسکیں. اور اسی مشغولیت کے سبب بچے بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ والد تو مصروف روزگار ہے اور والدہ امور خانہ داری میں مصروف ہوتی ہے اور وہ اپنے تئیں بچے کو مقررہ وقت پر اسکول، ٹیوشن تو بھیجتی ہے لیکن اس کی دوسری سرگرمیوں سے ناواقف ہوتی ہے. یہیں سے بچہ بڑھاوا پاتے ہوئے غلط صحبتوں اور خصلتوں میں ملوث ہو کر اپنی حسین اور خوبصورت زندگی کو تباہی کے راستے لے کر نکل پڑتا ہے. اور جب تک اس کی حرکتیں والدہ تک آتی ہیں تو وہ اپنی محبت اور شفقت میں والد کے سخت رویوں سے بچا کر سمجھانے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہاں پردہ داری اس کی بے راہ روی میں اضافہ کرنے کا موقع دیتی ہے نتیجتاً کچھ وقفے کے بعد یہی بچہ بار بار کی روک ٹوک اور سمجھانے سے چڑچڑے پن کا شکار ہو کر بدزبانی و بدکلامی اختیار کرلیتا ہے اور پھر وہ باپ سے متنفر ہو جاتا ہے مار پیٹ تک بات آ کر نظر انداز کرنے تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ وہ بار ہاں سمجھانے اور تاکید کرنے کے بعد بھی انہی راستوں پر گامزن ہوتا ہے. اور اپنی خوبصورت سرمایہ زندگی کو تباہی تک لے آتا ہے اور تب تک سدھر نہیں سکتا جب تک اسے کوئی ایسی ٹھوکر نہ لگے جو اس کی آنکھوں کو چندھیا دے. دوسری سب سے بڑی وجہ اولاد یا ان تمام بچوں کے بدکاری اور غلط راستوں کی طرف بڑھنے والا رجحان فراوانی دولت ہے، اور ماں کی نظر اندازی باپ کی بے توجہی. دولت کے نشے میں غرق والدین اپنی اولادوں کی تمام تر خواہشات کو پورا کرتے چلے جاتے ہیں جس سے وہ بچے فضول خرچی پر آمادہ ہو جاتے ہیں. بنا کسی روک ٹوک کے منہ سے نکالی ہوئی ضرورتیں پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں اور بے تحاشہ پیسوں کا ملنا اور اس پر نظر نہ رکھنا بربادی کا سبب بن جاتا ہے اور بچے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں. جب تک ان کی غلط سرگرمیوں کی خبر والدین کو ہوتی ہے تب تک معاملہ اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ بچہ والدین کے قابو میں نہیں ہوتا. آوارہ گردی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، دین و دنیا سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا کیونکہ اسے وہ ماحول نہ گھر پر میسر ہوا اور نہ ہی آس پاس کے لوگوں میں، اور ساتھ ہے بری صحبتوں کا شکار ہو کر اپنی دنیا و آخرت کو تباہ کرلیتا ہے اور تمام زندگی اسی طرح گزارنے پر مجبور بھی. جو اس کی اور آنے والی نسلوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے. آج کل موبائیل اور سوشل میڈیا کا استعمال بے تحاشہ ہو رہا ہے جو

نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کر رہا ہے. تعلیم سے منسلک بچے یا نوجوان موبائیل کا استعمال تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کر رہے ہیں. موبائیل ایک طرف فائدہ مند ہے تو دوسری طرف نقصاندہ بھی. موبائیل فون ہماری ذاتی معلومات کے ساتھ وقت ضرورت اسکول اور کالج کے سرگرمیوں کو با آسانی سمجھ کر مکمل کرنے میں بھی مددگار ہوتا ہے. اس کے علاوہ ہمیں دنیا بھر کی تمام تر معلومات با آسانی میسر ہو جاتی ہیں. آج کل مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری میں یہ فون تعلیم حاصل کر رہے طلبہ کے لئے. بہت ہی معاون ہے. اور اس کے ذریعے لاکھوں سے زائد طلباء اپنی تعلیمی تشنگی کو پورا کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف یہی موبائیل فون اور اسی انٹرنیٹ سے بچے غلط راستوں کو اختیار کر مختلف سوشل ویب سائٹ کا استعمال کرتے ہوئے خود کو اس میں اس قدر غرق کر لیتے ہیں کہ راتوں کی نیند اور سکون تباہ کر لیتے ہیں. اور یہ بے سکونی ان کی زندگی کو ایک الگ رنگ دے جاتی ہے. اگر کہیں کسی غلط صحبت میں پڑتے ہیں تو غلط و عریاں فحش فلموں میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگتی جس سے وہ اپنی زندگی کے مقاصد سے لا پرواہ ہو کر اپنی دنیا و آخرت دونوں کو تباہ کر لیتے ہیں. یہاں والدین ان کی تربیت میں ذمہ دار ہو جاتے ہیں کیونکہ بچوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر وہ موبائیل فون فراہم تو کر رہے ہیں لیکن ان کی نگرانی کرنا جو ایک اہم ذمہ داری بن جاتی وہ کہیں نہ کہیں نظر انداز ہو رہی ہے. بچوں کا موبائیل وقتاً فوقتاً دیکھنا کہ بچہ کس طرح موبائیل فون کا استعمال کر رہا ہے، وقت کا خیال رکھنا، کس طرح کے دوستوں سے تعلقات ہیں سوشل ویب سائٹ کی دوستیوں میں ملوث تو نہیں وغیرہ. یہ تمام تر ذمہ داریاں والدین کی ہی ہیں جو ذرا سی کوتاہی، بے دھیانی سے بچوں کی جنت نما زندگی کو دوزخ سے بھی بدتر بنا سکتی ہے. یہ بچے قوم و ملت کا ایک روشن مستقبل ہیں. ملک کی ترقی اور ہماری معاشرتی ترقی کو بڑھاوا دینے میں معاون و مددگار ہیں، تو ان بچوں کی رہنمائی ان کی دیکھ بھال ہمارا فرض عین ہے. مذکورہ باتوں کے علاوہ ہزار ہاں وجوہات ہیں جو چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ نوجوان نسل کو تباہی کے دہانے پر لے آتی ہیں جن کو یہاں مختصر سے مضمون میں بیان کرنے کی گنجائش نہیں، جس سے ہم بخوبی طور پر واقف ہیں لیکن اس کے سدباب کے لئے غور نہیں کر رہے یا عملی طور پر صحیح ڈھنگ سے کوشش نہیں کی جا رہی ہے. یہاں ذمہ دار والدین تو ہیں لیکن اس کے علاوہ سماج کا ہر فرد اور ایک ذمہ دار شہری بھی لوگ شامل ہیں. بچوں کی تربیت اور پرورش گھر سے ہی شروع ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے ماں کی گود بچہ کا پہلا مدرسہ ہے جہاں سے وہ پلتا بڑھتا اور صحیح غلط سیکھتا ہے. تو یہاں سب سے اہم بات یہ عیاں ہوتی ہے کہ والدین عملی طور پر دیندار مذہبی ہوں گے بچوں کے سامنے جس طرح عمل کریں گے جو کردار پیش کریں گے وہی وہ اپنے عادت و اطوار میں شامل کرتا جائے گا. لہذا ایک والدین و سرپرست کی حیثیت سے عملی اور مثالی نمونہ کے طور پر اپنے کردار کو بچوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے. خدائے تعالی قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے، مال اور اولاد دنیا کے لئے زینت ہیں لیکن تب جب اس کی تربیت صحیح ڈھنگ سے کی جائے گی دینی و دنیاوی تعلیم سے آشنا کرایا جائے گا. اور اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے کہ مال اور اولاد دنیا کے لئے فتنہ ہیں، یہ تب جب اولاد کی پرورش صحیح طرح سے نہ ہو غلط صحبتوں میں ملوث ہو جائے اور ناجائز و بدکاری کی طرف مائل ہو جائے. اگر اولاد بہترین اور نیک ہے تو اس کا اجر والدین کو مرنے کے بعد ثواب کی صورت ملتا رہے گا، اور اگر بدکاری کی طرف راغب ہوا تو اس کے گناہگار والدین و سرپرست ہوں گے جو اسے سیدھی راہ پر مائل نہ کر سکے. لہذا ضروری اور اہم یہ ہے کہ تمام والدین اپنی اولاد کے سامنے ایک مثالی کردار کے ساتھ خود کو پیش کریں.

افسانچہ: مکافاتِ عمل

صبیحہ انصاری۔ ٹی وائے بی اے

آج کئی مہینوں بعد کالج کی سہیلی سے ملاقات ہوئی۔ حال چال پوچھنے پر وہ بے چاری اپنی تکلیف بتانے لگی۔ شادی کو پانچ سال ہو گئے پر اب تک اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ اوپر سے سسرال والوں کے طعنوں نے اس کا جینا حرام کر دیا ہے۔ میں نے حوصلہ دیا خوب دعائیں کرنے کو کہا اور ہم اپنے اپنے گھر آ گئے۔ گھر آ کر میں نے امّی کو اس سہیلی کے متعلق بتایا۔ امّی اسے فوراً پہچان گئی اور کہا "یہ وہی ہے نہ جس نے اپنے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی تھی؟.... بیٹا ماں باپ کا دل دکھانے پر اللہ کہیں نہ کہیں سے سزا تو دے گا ہی... انسان یہ نہیں سوچتا اس کے اوپر جو مصیبتیں آئی ہے وہ اسی کے گناہوں کی سزا ہے، یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے، جیسا عمل کرو گے ویسا پھل ملے گا"... امّی کی باتوں نے میرا ذہن ایک نئی سمت موڑ دیا۔

افسانچہ: معصوم بچّے

صبیحہ انصاری۔ ٹی وائے بی اے

آج ایک بہت ہی عجیب مگر فکر میں ڈالنے والا واقعہ ہوا میں اور میری امّی دو پہر کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے پڑوس والے گھر میں پیاری پیاری پانچ بچیاں ہیں، وہ سبھی بہنیں باہر کھیل رہی تھیں ان میں سب سے چھوٹی اور سب سے خوبصورت بچی مائرہ ہے اس کی بڑی بہن نے شاید کوئی کھلونا اس کے ہاتھوں سے چھین لی اسی وقت مائرہ کے منہ سے ایک بہت ہی نامعقول گالی نکلی، میں پہلی بار اتنی پیاری لڑکی کے منہ سے وہ گالی سن رہی تھی اور وہ گالی مائرہ کے منہ سے کچھ اور بھی بری لگی، مائرہ نے ابھی ابھی تو صحیح سے بولنا شروع کیا تھا چونک کر میں نے میری امّی کی طرف دیکھا اور یہی حال میری امّی کا بھی تھا۔ سچ میں بچے کتنی جلدی سیکھتے ہیں......

عظمتِ حیا

حیا ہے وصف پیارا سا
جو ایمان کا ایک جز ہے
جو ایک اخلاقی پہلو ہے
یہ ہے ایک وصفِ نورانی
اس کا جلوہ بھی نرالا ہے
کہ جس میں بھی حیا گر ہو
وہ انساں رب کا پیارا ہے
ہر ایک کا دُلارا ہے

نظر جس کی نہ بھٹکے اور
تصور بھی ہو پاکیزہ
اگر چہ ہو ہم محفل میں
یا تنہا ہی ہم بیٹھے ہوں
خدا کا خوف ہو دل میں
رضا کی فکر ہو رب کی
خفگی سے ڈریں ہر دم
حیا ایسی ہو ہم میں
حیا والے ہوں ہم ایسے
حضرتِ عثمان میں تھی جیسے
جیسے حضرتِ شعیب کی بیٹی
جس کی مدح میں رب نے قرآن میں فرمایا
تمشی علی استحیا

حیا اسلام کی عادت
یہ ہے ایمان کی زینت
اس سے ہی تو ہے عزت
اسی میں پوشیدہ عظمت
ہے نبیوں کی بھی یہ سنت

ہمیں اب چاہیے کہ ہم
حیا کا زیور اپنائیں
اسے زینت بنا کر ہم
خود کو اس سے سجائیں!!

مومن صبا شعیب ٹی وائے بی اے

Maharashtra College

مہاراشٹر کالج کو۔۔۔ہم کیسے بھول پائیں گے؟!!

صباشعیب مومن،ٹی وائے بی اے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ ثم الحمدللہ۔۔۔!!

آج آخری پرچے کے ساتھ ہمارے بی اے تعلیمی سال کا اختتام ہوا۔

یہ ہماری سعادت مندی ہے کہ ہم مہاراشٹر کالج کے طالب علم ہیں۔ہم نے اس علم وفن کے گہوارے سے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نے مختلف فنون میں ایک حد تک پختگی بھی حاصل کرلی۔

کالج کے پرنسپل محترم سراج الدین چوگلے اور وائس پرنسپل اور شعبہ کے اساتذہ کی سرپرستی میں اردو زبان کے مختلف مسابقوں اور تقریبات میں شرکت کے ساتھ ہم نے کالج کے مختلف شعبہ کے مقابلوں اور تقاریب میں بھی شرکت کی۔کالج کا طریقہ تعلیم بھی منفرد اور قابل ستائش ہے۔۔۔!!

اے مہاراشٹر کالج تجھے سلام۔۔!! تیری خدمتوں کو سلام۔!! تیری عظمتوں کو سلام۔۔!!

سچ تو یہ ہے کہ اس کالج میں داخلہ سے قبل ہمیں مضمون وغیرہ لکھنے میں پریشانی درپیش ہوتی تھی لیکن الحمد للہ کالج میں شعبہ اردو کے نقشِ دیوار ''شعورِنو'' نے ہمیں وہ حوصلہ عطا کیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔علمِ عروض سے کچھ واقفیت کے بعد شعرگوئی بھی قدرے آسان معلوم ہوئی اور اساتذہ کرام کی اصلاح نے اس فن کو مزید جِلا بخشی اور پرواز ہفتہ تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا اسٹیج رہا جہاں ہم نے اساتذہ کی تربیت سے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا اور اس میں مزید نکھار پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

خصوصی طور اردو زبان کے دو علم بَردار، قابل احترام استاذ (صدر شعبہء اردو) ڈاکٹر ماجد قاضی اور پروفیسر اظفر خان کی بے پناہ معاونت کے ہم بہت مشکور وممنون ہیں کیوں کہ اُنھیں کہ حوصلوں نے ہمیں ایک اڑان عطا کی اور کچھ نیا کرنے کا جذبہ ہم سب میں بےدار کیا۔۔!!

ہمیں لعل والماس کر دینے والے سلیقہ وعلم وہنر دینے والے لیاقت وخوبی سے بھر دینے والے

یہ استاذ ہیں جن سے ہم میں مہک ہے یہ استاذ ہیں جن سے ہم میں چمک ہے بلندی پہ اڑنے کو پَر دینے والے

تمام ہم جماعت ساتھیوں کا بھی شکریہ۔۔۔آپ سب کی ہم سے وابستہ اُمیدوں نے ہمیں ہر میدان میں آگے بڑھنے میں بھرپور معاونت کی!!

الحمدللہ!! اردو زبان سے گریجویشن مکمل کرکے ہم کافی پُر اعتماد ہیں کیوں کہ اس شیریں زبان نے ہمارے لہجہ کو شیرینی عطا کی۔۔اور بے شمار نئے الفاظ ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش کر دیے۔ہم پُر امید ہیں کہ یہ زبان مستقبل میں لئے ہمارے جامع تخلیقات کا سامان بنے گی جس سے قوم کا ہر فرد مستفیض ہوگا!!

اساتذہ سے ہم اپنی کوتاہی اور گستاخیوں کے لئے معذرت خواہ ہیں۔تمام ساتھیوں سے بھی معافی۔اگر ہم نے آپ کی کسی بھی موڑ پر قصداً یا سہواً دل آزاری کی ہو تو اس کے لیے بہت بہت،معذرت!!!

اساتذہٴ کرام اور کالج کے لیے ڈھیر ساری پُرخلوص دعائیں۔اللہ تعالی اساتذہٴ کرام کی عمر میں صحت وعافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے اور دونوں جہاں میں بہترین جزادے اور مہاراشٹر کالج عافیت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرے۔۔۔! آمین ثم آمین

چھٹیوں کے دن!!!

رابعہ شیخ، ٹی وائے بی اے

امتحان سے فرصت مل چکی تھی۔ چھٹیاں شروع چکی تھیں۔ ہم ۱۱ر بجے سو کر اٹھنے والے بڑی فرماں برداری سے ۸ر بجے بیدار ہو جایا کرتے۔ اتنے سویرے اٹھنے پہ امی جان بڑی حیرت سے دیکھتیں پر خاموش رہتیں۔ بالآخر ایک دن انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ" سب ٹھیک تو ہے نا؟؟" ہم نے بڑے تعجب سے امی کو دیکھ کر جواب دیا کہ" جی سب خیریت!! کیوں کچھ ہوا ہے کیا کہیں" تو جواب ملا کہ" نہیں!! وہ آج کل تم کرنوں کے زمین پر پڑنے سے پہلے جاگ جارہی ہو ورنہ امتحان کے دنوں میں تو مُردوں سے شرط لگا کے سویا کرتی تھیں اسی لیے خیریت دریافت کی۔" تو ہمیں بڑی شدت سے احساس ہوا لیکن امی جان صرف حس بیدار کرنے میں کامیاب رہیں، غیرت دلانے میں ابھی بھی ناکام ہوگئی تھیں۔

خیر!!! ہم سر جھٹک کر اپنے معمول کے کاموں میں لگ گئے۔ چھٹیوں میں پڑھنے کا فی صد بھی حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا تھا۔۔۔ شب و روز کتابوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔۔۔ نہ کہیں گھومنے کی حسرت تھی۔۔۔ نہ بازار سے کوئی ضروریات پوری کرنی تھیں۔۔۔ نہ کچھ کھانے کا دل کرتا۔۔۔ نہ ہی زبان کو زنگ لگا تھا۔۔۔ صحت بھی الحمدللہ قدرے بہتر تھی۔۔۔ اُس وقت نہ کسی کا فون ہی آتا نہ ہمارا ہی کسی سے بات کرنے کو دل کرتا۔

امی یہ سب دیکھ کر ضبط کرتی رہیں پر کب تک نجات ممکن تھی۔ ایک دن جواب دہ ہونا ہی پڑ گیا۔ اُس دن امی خلافِ معمول کچھ زیادہ ہی غصے میں لگ رہی تھیں اور امی کا چڑھا پارہ دیکھ کر ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آج کل تو ماشاءاللہ سے مثالی اولاد کا عمدہ نمونہ بنے ہوئے ہیں۔۔۔ کوئی غلطی یا کوئی حرکت پچھلے کئی دنوں سے ہم سے کنارہ کیے ہوئے ہے پھر یہ عتاب کیوں نازل ہوا؟؟؟؟

ابھی اپنے تخیّل کی پرواز کو ایک نئی سمت دیتے اُس سے پہلے امی کی آواز نے ہمارا سکوت توڑا۔ اب امی پہلے سے بھی کچھ کہہ رہی تھیں یا نہیں یہ تو امی ہی جانیں اور رب جانے پر ہم جو سن سکے وہ الفاظ یہ تھے" ساری دنیا امتحان میں دن رات ایک کیے رہتی ہے۔۔۔ کھانا پینا بھول کر کتابوں کی ہو جاتی ہے۔۔۔ امتحان میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔۔۔ اور ایک یہ ہیں اللہ ہی خیر کرے ان کی۔۔۔ امتحان ہوں تو کتابوں سے بیر رکھتے ہیں اور فارغ ہوں تو کتابوں کی جان نہیں چھوڑتے۔۔۔ خدا ہی سمجھے کیا بنے گا ان کا، ابھی خوب پڑھو۔۔۔ دن رات پڑھو۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے پڑھو۔۔۔ جیسے ہی اگلا سیمسٹر شروع ہو کتابیں باندھ کر شرافت سے رکھ دینا اور امتحان ختم ہوتے ہی پھر ان کی جانوں کو چمٹ جانا اور کتابیں باندھتے اور کھولتے وقت کبھی نہ سدھرنے کے قسم کھا کر ہی کتابیں کھولنا اور بند کرنا۔۔۔"

شانِ فاروق اعظم

الفیہ بانو عبدالوسیم
بارہویں سائنس

فاروق ہے لقب مزاج ہے مختلف
چہرے پر نور ہے، نام ہے عمرؓ
یہ جو چلے راستے پر شیطان دور ہٹ جائے
ایسا ہی کوئی رہبر ہمیں بھی مل جائے
عمر ابن خطاب نام ہے ان کا
حوصلوں سے پُر کام ہے ان کا
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ ہوتا عمرؓ
مشکل سے ملتے ہیں درختوں پر ایسے ثمر
نہ بخشے بیٹے کو جرم پر اسکے
جو حاکم ہو تو ایسا ہو، حکومت ہو تو ایسی ہو

پروفیسر
شاھدؔ ذکاء اللہ

گزرے ہوئے لمحات کی زنجیر بنا ہوں
ماضی سے نکلنے میں ذرا وقت لگے گا

اک شہرِ آرزو کو اندھیرے میں دیکھ کر
لگتا ہے دیا خون سے جلتا ہی رہے گا

انصاف کی امید بھی رکھنا ہے حماقت
فرعون ہی جب فیصلے تحریر کرے گا

کردارو علم و ذہن کی تابانی چھوڑیے
انسان کی پہچان وہ کپڑوں سے کرے گا

بہہ جائے گی تنکوں کی طرح ساری رعونت
مظلوم کی آہوں سے جب سیلاب اُٹھے گا

نفرت کی سیاست میں کوئی جیت نہیں ہے
مقتول کا ہر قطرۂ خوں گرتے ہی کہے گا

اک انچ بھی ہٹنے کو وہ تیار نہیں ہیں
اب ہم بھی دیکھتے ہیں کہ سرکس کا جھکے گا

کیوں ہم ہی رہیں درد کی تصویر کی مانند
اب صبر کا پیمانہ تو لبریز رہے گا

کب تک غمِ حیات میں الجھے رہیں گے لوگ
اب سر سے کفن باندھ کے ہر فرد چلے گا

محتاط ہو کے بات میں کرتا ہوں آج کل
پھر بھی وہ مری بات کو سازش ہی کہے گا

تنہا ہوں اپنے شہر میں شاہدؔ میں آج کل
لیکن خیال اُن کا مرے ساتھ رہے گا

محنت میں عظمت

شیخ زینب محمد صغیر، بارہویں سائنس

شفاء اور کلثوم دونوں بہنیں تھیں۔ شفاء کو پڑھنے کا بہت شوق تھا جبکہ کلثوم اپنا سارا وقت کھیل کود میں گزارتی۔ اسے پڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اسکول میں جب ٹیسٹ ہوتا تو وہ نقل کرتی۔ جبکہ شفاء اپنا ٹیسٹ دل لگا کر یاد کرتی اور اپنے ٹیسٹ میں اول پوزیشن لے لیتی۔ اسی وجہ سے اساتذہ اور ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے تھے جس کی وجہ سے کلثوم اس سے جلنے لگی۔ وہ ہر وقت اسے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچانے کے چکر میں رہتی لیکن ہمیشہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو جاتی۔ اس لیے اس سے تنگ آ کر شفاء کا پیچھا چھوڑ دیا۔ شفاء اپنا وقت پڑھائی میں گزارتی جبکہ کلثوم اپنا وقت کھیل کود میں۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔ اب ان کے امتحان سر پر تھے۔ کلثوم کو کوئی فکر نہ تھی جبکہ شفاء امتحانات کی تیاری خوب دل لگا کر کر رہی تھی۔ آخر کار ایک ہفتہ بعد ان کے امتحانات شروع ہو گیے۔ انگلش کا پیپر تھا، شفاء کو پیپر ملنے کا شدت سے انتظار تھا۔ ایک گھنٹے بعد ان کو پیپر مل گیا۔ ان کی میڈم نے سب بچوں کو اسکول کے گراؤنڈ میں بٹھایا اور سب کے ہاتھ میں انگلش کا پیپر تھما دیا۔ شفاء نے جلدی جلدی پیپر حل کر کے دے دیا۔ اسی طرح سب بچوں نے پیپر حل کر لیا۔ اب کلثوم گراؤنڈ میں اکیلی بیٹھی تھی کیونکہ اس کے پیپر کی تیاری نہ تھی اس لیے اسے پیپر نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران پیپر کا وقت ختم ہو گیا اور ان کی میڈم نے اس سے پیپر لے لیا۔ جب اسے پیپر آتا ہی نہیں تھا تو وہ پیپر کیسے حل کرتی۔ یوں سارے امتحانات ہو گیے۔ شفاء اپنے سارے پرچے حل کرتی جبکہ کلثوم خالی چھوڑ دیتی۔ امتحانات ختم ہوئے تو سب کو رزلٹ کا شدت سے انتظار تھا۔ ایک ماہ بعد رزلٹ آ گیا۔ شفاء کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے بہت اچھی پوزیشن اور انعام حاصل کیا تھا جبکہ کلثوم فیل ہو گئی۔ فیل ہونے پر وہ خوب روءی لیکن اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اب وقت گزر چکا تھا۔ شفاء بہت خوش تھی کیونکہ اس کی محنت رنگ لائی اور وہ کامیاب ہو گئی اور کلثوم کو اس کے نہ پڑھنے کا نتیجہ مل چکا تھا اور وہ ناکام ہو گئی تھی۔

تین غزلیں

معشوق یوسف۔ ٹی۔وائے۔بی۔اے

آج کل درد مرے دل کو بڑے رہتے ہیں
اشک بہتے نہیں پلکوں پہ جمے رہتے ہیں

❊

کچھ دنوں تک ہی محبت میں مزے رہتے ہیں
پھر تو چہرے پہ سدا بارہ بجے رہتے ہیں

❊

یہ محبت ہمیں ہوتی ہے تو اُن لوگوں سے
جو کسی اور کی قسمت میں لکھے رہتے ہیں

❊

اب نہیں ہوتی طلب ہم کو کسی چیز کی بھی
جیسے جس حال میں رہتے ہیں پڑے رہتے ہیں

❊

تو جلا رہتا ہے دل میں کہیں بجلی کی طرح
تیری یادوں سے مرے تار جڑے رہتے ہیں

❊

ان کا فیوچر تو خدا خیر کرے کیا ہوگا
یار جب دیکھو یہ پبجی میں لگے رہتے ہیں

❊

تیری گلیوں میں یہ معشوقؔ بھلا کیوں آئے
لوگ پتھر لیے ہاتھوں میں کھڑے رہتے ہیں

نہیں سمجھا کوئی میری نمی کو
کہاں لے جاؤں اپنی بے بسی کو

❊

اندھیرا، درد کتنا سہہ رہا ہے
خبر اے کاش ہوتی روشنی کو

❊

یہاں پر اور بھی ہیں خوب صورت
مرا دل چاہتا ہے پر اسی کو

❊

محبت بھی عجب ہے نا، کہ دیکھو
کسی کی فکر، رہتی ہے کسی کو

❊

میں شاعر یوں ہی تھوڑی بن گیا ہوں
صنم کی طرح چاہا شاعری کو

❊

یہ پیدائش سے اب تک رو رہی ہے
نہ جانے چاہیے کیا زندگی کو

❊

کئی خوبی بھی ہیں معشوقؔ مُجھ میں
مگر لوگوں نے دیکھا بس کمی کو

مشکل دور میں پلنا سیکھو
ہر ماحول میں ڈھلنا سیکھو

❊

راہیں مشکل بھی ہوتی ہیں
کانٹوں پر بھی چلنا سیکھو

❊

اپنی الگ پہچان بناؤ
بھیڑ سے ہٹ کر چلنا سیکھو

❊

جو بھی تم کو آفت سمجھے
اس کے سر سے ٹلنا سیکھو

❊

دل کے گلشن میں رہنا ہے؟
پھولوں جیسے کھلنا سیکھو

❊

رات کو روشن کر دو خود سے
معشوقؔ اتنا جلنا سیکھو

میرا خواب

انصاری آفرین محمد ناظم بارہویں کامرس

میں بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی ایک لڑکی ہوں-میرے ابو ممبئی میں کام کرتے تھے ہم سے سال دو سال میں ایک بار ملنے آیا کرتے تھے گاؤں والوں کا رویہ ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ابو ہمیں بھی ممبئی شہر لے گئے وہیں ہم بھائی بہنوں نے تعلیم حاصل کی-میرے ابو مجھے اور میری بہن کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے چاہے سکول کا فنکشن ہو یا کوئی تہوار۔ایک تو میں لڑکی تھی اور میری ہائیٹ بھی چھوٹی۔ایک دن ابو باہر سے بے حد غصے سے میں آئے اور ہم پر برس پڑے چلانے مارنے پیٹنے لگے بنا کسی وجہ کے میں روتے روتے اپنی خوشیاں تلاش کرتے اللہ تعالی سے اپنی بے بسی بیان کرتے میری آنکھ لگ گئی مجھے خواب آنا شروع ہوگیا-

صبح کی کرنیں میری آنکھوں پر پڑی.ایک ٹھنڈی ہوا میرے جسم سے ٹکرائی ایسا لگا جیسے وہ میرے آنسو پوچھ رہی ہو۔اچانک میں کالج میں داخل ہو جاتی ہوں۔میرے دوست مجھے گھمانے کے لیے آواز دیتے رہے ہیں تھوڑی ہی دیر میں نہایت خوبصورت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ بارش میں پہاڑوں کے بیچ دھنک کے نکلنے سے منظر اور خوش گوار ہوگیا۔سورج کی وجہ سے آسمان اور سمندر بھی چمکنے لگے۔رات میں چاند کے نکلنے سے سمندر کی بوندیں موتی کی طرح چمکنے لگی یہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو رہا تھا-ہم سب دوست مل کر گھر کی طرف روانہ ہوئے اچانک ہی ایک گاڑی آئی اور رات کے وقت لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئی سب لڑکیاں بیہوشی کی حالت میں تھیں جب آنکھ کھلی تو ہم سب ایک بند کمرے میں پڑے تھے اور بہت سی لڑکیاں زخمی حالت میں پڑی تھی۔

وہ سب روتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہمیں پاکستان لے جایا جائے گا اور ہمیں بیچ دیا جائے گا ہم پر بہت ظلم کیا جائے گا میں یہ سوچ میں پڑی تھی کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوگیا دروازہ کھلتا ہے اور منہ پر رومال باندھے ہوئے انسان داخل ہوتے ہیں اور لڑکیوں کو گھسیٹتے ہوئے ٹرک میں بھر دیا جاتا ہے تھوڑی دور جا کر ٹرک کا حادثہ ہو جاتا ہے اور ٹرک کا دروازہ کھل جاتا ہے ساری لڑکیاں باہر نکل جاتی ہیں اور پولیس کے پاس بھاگنا شروع کرتی ہیں ایسے میں کئی لڑکیاں پکڑی جاتی ہیں جن میں، میں بھی تھی۔ہمیں پاکستان کا بارڈر پار کرایا جاتا ہے اور نہایتی گندے کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے بھاگنے کی وجہ سے ہم پر ظلم کیا جاتا ہے۔زخمی حالت میں ہم لڑکیاں موت کا انتظار کر رہی تھی۔کہ اچانک گولی بارود کی آواز آنے لگی ہر جگہ دھواں چھایا ہوا تھا ہمارے کمرے کا دروازہ آگ سے جل کر راکھ ہو رہا تھا ہم سب موت کا انتظار کر رہے تھے اچانک دروازے سے روشنی آتی ہے اور کچھ فرشتے ہمیں بچانے کے لیے آتے ہیں انہیں دیکھ کر ہماری سانس میں سانس آئی اور کچھ امید کی کرن نظر آئی۔

میں دھوئیں کی وجہ سے اسی وقت بے ہوش ہو گئی جب میری آنکھ کھلی تو میرا سر اس فرشتے کی گود میں تھا اور میں پاکستان کا بارڈر پار کر چکی تھی اور میری آنکھوں میں ایک الگ سی چمک تھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے پوری دنیا کو سمجھ لیا ہے اچانک میرے کانوں میں ایک سخت لہجے میں آواز گونجی آفرین بیٹی اٹھو کھانا کھالو۔ابو کی آواز سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں خواب دیکھ رہی تھی اور مجھے اچھے سے سمجھ میں آگیا کہ امی ابو ہمارے لئے جو کرتے ہیں وہ ہماری بھلائی کے لئے ہی کرتے ہیں-

موت

دولتِ دنیا کے پیچھے تو نہ جا　　آخرت میں مال کا ہے کام کیا!

پٹھان متینہ محمّد انور

موت کا ایک دن معین ہے. بے شک موت ہر انسان اور جانور کو آنی ہے. موت کی کوئی دوا نہیں ہر شئے کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے. موت ایک حقیقت ہے اور سچّی بات ہے. اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا. ہمارے یہاں سائنس دانوں نے بہت ترقی کی مگر موت کا علاج آج تک کوئی نہ کر سکا ہے اور نہ کر سکے گا. کیونکہ یہ قدرتی چیز ہے موت سے کوئی چھپ نہیں سکتا. ہر انسان کو موت کا سامنا کرنا ہے انسان زندگی میں دن بدن ترقی کرتا ہے خوب دولت کما لیتا ہے مگر موت کو کوئی بھی امیر زادہ یا بادشاہ بھی خرید نہیں سکتا. موت کسی کی محتاج نہیں. موت طوفان کی طرح آتی ہے اور آندھی کی طرح چلی جاتی ہے. افسوس صد کروڑ افسوس جس کو موت آتی ہے اسے اپنے خاندان، رشتے دار، دوست احباب، مال و دولت کو نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔

یہ شعر سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ دولت صرف دنیا ہی میں رہ جائے گی اور انسان حقیقت میں دولت کے پیچھے ہی بھاگتا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ موت تو اسکے پیچھے ہی ہے. اور وہ جیسے جیسے نزدیک آتی ہے ہمیں سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھ جانا ہے. آخرت میں مال و دولت، سونا چاندی، ہیرے موتی کام نہیں آتے ہے بلکہ انسان تو صرف اپنے ساتھ اپنے اچھے اور برے اعمال کا وزن اٹھا کر چلتا ہے. اپنے اعمال کی وجہ سے ہی وہ جنّت او جہنّم میں جائے گا. آخرت میں انسان ایک ایک نیکی کے لیے ترسے گا لیکن ہائے افسوس کے اس وقت نہ ماں کام آئی گی نہ باپ نہ بھائی اور نہ بہن.....

زندگی میں ہم صرف دولت کے پیچھے ہی بھاگتے ہے. کوئی یہ نہیں دیکھتا کی ہم نے جو مال کمایا ہے وہ حلال ہے یا حرام؟ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ میں کب مروں گا؟ کیسے مروں گا؟ میں جنّت میں جاؤں گا یا جہنّم میں؟ انسان اپنی زندگی گزارتا چلا جاتا ہے. اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی فضول خرچی کی طرح گزار رہا ہے. آج ہمارے گھر میں ایک دن بھی لائٹ چلی جائے تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا گھبراہٹ سے ہماری جان نکل جاتی ہے. گرمی میں ٹھنڈا پانی نہ ملے تو ہم بے چین ہو جاتے ہے. رات میں اگر کبھی کوئی مچھر کاٹ لے تو ہم چلّا اٹھتے ہے مگر قبر میں ہم ہل تک نہیں سکے گے دو گز زمین میں قید سے ہو جائیں گے اور ہم غذا بن جائے گے کیڑے مکوڑوں کی تو کبھی سانپ کاٹے گا تو کبھی کوئی اور مگر ہم کچھ نہیں کر پائے گے۔

پیچ و تاب اور میں۔۔۔۔

محمد آصف شعبۂ اردو (جونیئر کالج)

عزیز دوستو! میں بھی آپ ہی کی طرح اردو کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور ہر وقت اردو زبان کی خدمت و فروغ میں کوشاں رہتا ہوں۔ مَیں کم از کم روزانہ اخبار، چند اردو مضامین اور ایک آدھ رسالے پر طائرانہ نظر ڈال کر اردو کی خدمت کرنے والے بڑے بڑے لوگوں کی فہرست میں چھوٹا ہی سہی پر اپنا نام درج کروانا چاہتا ہوں اور جب بھی موقع ملے کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں، اور یہ سوچ کر لکھتا ہوں کہ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے لیکن میں ضرور پڑھوں گا۔ ویسے بھی لوگوں کے پاس وقت کہاں کہ کسی طالب علم کی کتاب یا مضامین کا مطالعہ کرے اور اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ یہی سوچ کر میں نے بھی ایک کتاب بعنوان ''پیچ و تاب'' تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا مواد تو پہلے ہی سے تیار تھا لیکن کتاب کی طباعت و اشاعت کے مراحل کو اگر بیان کروں تو ایک مضمون تیار ہو جائے۔

میں نے اس کتاب کے مضامین طلبہ کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دیئے ہیں عام طور پر اس میں ایسے موضوعات ہیں کہ جن سے روزانہ ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ان مضامین میں وہ تجربات و مشاہدات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہر انسان کے گرد گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد بے شمار قصے کہانیاں اور واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں کچھ اچھے اور کچھ قابل اعتراض ہوتے ہیں لیکن ہم نے قابلِ اعتراض باتوں یا کاموں کو درست کرنے یا اس کی اصلاح کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے اس لیے ہم اسے کافی حد تک نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی اپنی زندگی میں خوش و خرم رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے کچھ حساس قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اطراف کی آلودگی کو پاک کرنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں چاہے اس کے عوض انھیں بدنامی کا سامنا کرنا پڑے یا مصیبت کا وہ بس ڈٹے رہتے ہیں۔

میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ قلم کی دھار (تحریر) تلوار کی دھار سے بھی تیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں تلوار کے دھنی و غازی کا متبادل قلم پکڑنے والے منشی اور ادیب ہو گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو کے مختلف اصنافِ سخن سے معاشرے کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک اردو ادب میں طنز و مزاح کی صنف اصلاحِ معاشرہ کے لیے بڑی کارگر ہے۔ افسانے کے ذریعے افسانہ نگار معاشرے کی حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، ڈرامہ نگار ڈرامے کے ذریعے سماج کے سلگتے مسائل و فرسودہ پہلوؤں کو کرداروں کی اداکاری کے ذریعے منظر عام پر لاتا ہے اور شاعر اپنی شاعری میں کبھی مبالغہ آرائی و سنجیدگی سے تو کبھی مختلف تشبیہات و استعارات کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ ہر فن کار اپنے فن کے ذریعے سماج و معاشرے کی وہی تصویر پیش کرتا ہے جسے وہ دیکھتا ہے۔ غم ہے تو ان کی تحریروں میں غم نظر آتا ہے، خوشی ہے تو خوشی نظر آتی ہے بہ غرضِ اصلاح کوئی تلخ روئی سے کام لے تو ممکن ہے قاری کو وہ گراں گزرے اسی لیے ہر کوئی اپنی بات رکھنے کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لیتا ہے اس لیے مجھے بھی اپنی بات رکھنے کے لیے اس سے بہتر متبادل نظر نہ آیا۔

میں اپنے تمام محسنین کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ میری کتاب ''پیچ و تاب'' کے مضامین کا مطالعہ کریں گے یہ وہی مضامین ہیں جو ہر سال مہاراشٹر کالج کے پروگرام شیام کشن نگم ٹرافی مقابلہ میں پڑھے گئے جنھیں طلبہ و سامعین کے ذریعے کافی سراہا گیا۔ میں ممنون ہوں ان تمام اساتذہ کا کہ جنھوں نے مجھے اس قابل بنایا۔ میں بالخصوص شکر گزار ہوں مہاراشٹر کالج کا کہ جہاں مجھے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور سنوارنے کا بہترین موقع ملا اور وہاں کے اساتذہ کا جو گاہے بہ گاہے میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے رہے۔ یہ انہی کی دعاوں اور محبتوں کا ثمرہ ہے کہ میری پہلی کتاب ''پیچ و تاب'' منظر عام پر آچکی ہے اور آپ کے مطالعہ کی منتظر ہے یہ میرے لیے بڑی خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔

شکریہ۔۔۔

''شعر کو نئے زاویے سے دیکھیے''

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس شعر میں صنعت ایہام ہے۔ روتا رہنا اور سوتا رہنا دونوں محاورے ہیں۔کاہے کو سے مراد کیوں ہے۔
شعر کے معنی ہیں کہ اگر میر خود اتنے زور وشور سے شکوہ شکایت کرتا رہے گا تو ہم سایہ بھی غافل نہیں رہے گا۔ وہ بھی میر کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے کمر بستہ ہو جائے گا۔
میر نے آپ بیتی کے پردے میں پڑوسیوں کو لڑنے کے گر بتائے ہیں۔کامیاب وہ ہوگا جو خاموشی سے اپنی چال چلے گا۔شور مچانا اور لوگوں کی ہم دردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرنا دراصل خود ہی دشمن کو خبر دار کرنا ہے۔

مجھ سے یہ پیاس کا صحرا نہیں دیکھا جاتا
روز اب خواب میں دریا نہیں دیکھا جاتا

کٹ حجتی: پہلا مصرع
آپ سے یہ صحرا نہیں دیکھا جاتا تو وہ صحرا دیکھیے،
اب نہیں دیکھا جاتا تو بعد میں دیکھیے،
پیاس کا نہیں دیکھا جاتا تو بھوک کا دھوپ کا ریت کا اینٹ کا صحرا دیکھیے، کوئی حرج نہیں نہ کوئی پابندی ہے۔
صحرا بڑا ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھا جاتا تو اسے condense کر کے دیکھیے۔کسی خاص چشمے سے نہیں دیکھا جاتا تو چشمہ بدل کر دیکھیے،
پیاس کا صحرا نہیں دیکھا جاتا تو پیاس کا سمندر یا میدان وغیرہ دیکھیے، آپ سے نہیں دیکھا جاتا تو کسی دوسرے سے دیکھنے کی درخواست کیجیے۔

آپ نے اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جمائے ہیں تو شاید پتلون بدلنے میں آپ کو دشواری پیش آئے گی۔
آج کمپیوٹر نے آپ کو شطرنج میں مات دی ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کک باکسنگ میں وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔
کوئی آپ سے سوئمنگ پول کی تعمیر کے لیے چندہ مانگے تو صرف ایک گلاس پانی مت دینا، لوگ آپ کو کنجوس سمجھیں گے۔
آپ مشورہ کیوں نہیں دیتے، کم از کم دوسروں کا مال ہی آگے بڑھائیے، لوگوں سے ملنا جلنا کم ہونے لگے گا، آپ کی زحمتیں کم ہوں گی۔

غزل ''خواب''

شیخ محمد احمد۔ بارہویں سائنس

ہو عشق ہر کسی سے ایسا بھی تو نہیں
وہ شخص مل ہی جائے ایسا بھی تو نہیں

ہر شام ذہن میں اس کا ہی رہے چہرہ
پھر خواب میں وہ آئے ایسا بھی تو نہیں

خوابوں میں ابھی باتیں اس سے ہی ہو رہی ہوں
پھر آ کے وہ جگا دے ایسا بھی تو نہیں

تم کو بھی اُس سے عشق ہو، اس کو بھی ہو محبت
پھر بات بن ہی جائے ایسا بھی تو نہیں

اتنا قریب ہو وہ، دیکھیں اُسی کو ہر دم
پھر بات بھی کرے ہم ایسا بھی تو نہیں

ویسے تو زندگی میں کھائے بہت سے غم ہیں
احمد بھی مر ہی جائے ایسا بھی تو نہیں

غزل

اطہر عالم۔ بارہویں آرٹس

میں تیری محبت کا طلب گار نہیں ہوں
گل ہوں چمن کا، دیکھ کوئی خار نہیں ہوں

میں بھی تو رک گیا ہوں تیری دید کی خاطر
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ہر بار غلطیوں کا بدل معافی نہیں ہے
اک سادہ سا انسان ہوں غفار نہیں ہوں

رکھتا ہوں اپنے آپ میں، میں بھی تو اک جہاں
منزل سے ہوں بھٹکا ہوا، بیکار نہیں ہوں

مجھ کو بھی شوق عزت وشہرت کا ہے مگر
لیکن تری طرح سے میں بے قرار نہیں ہوں

میں بھی ہو تیرے چاہنے والوں کی بھیڑ میں
طالب ہوں محبت کا گنہگار نہیں ہوں

وعدہ میرا جھوٹا نہیں ہر بار کا 'اطہر'
اچھے دنوں کی میں کوئی پیکار نہیں ہوں

صدف

المجلة السنوية لكلية ماهاراشترا ، مومبائى-٠٨

القسم العربي

رئيس التحرير

البروفيسور شمس الرب خان

مدير التحرير

كاشف شكيل
السنة الثالثة للبكالوريوس

لجنة التحرير

أرمان أنصاري السنة الثالثة للبكالوريوس
أنصاري ثناء السنة الثالثة للبكالوريوس
شيخ ذكية السنة الثانية للبكالوريوس

فاطمة أنصاري محمد عارف السنة الثالثة للبكالوريوس
سمية بنت محمد فخر الإسلام السنة الثالثة للبكالوريوس
رويدة محمد رويش السنة الثانية للبكالوريوس

الحياة رحلة

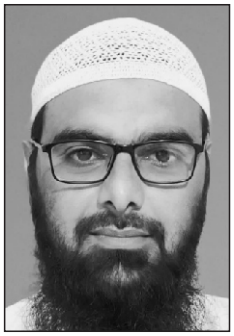

محمد مجاهد خان الندوی

الاستاذ المساعد

قسم اللغة العربية و الدراسات الاسلا

مهاراشترکالج، مومبائی۔۰۸

يصف الشاعر الأردوية إبراهيم ذوق الحياة و هو

يقول:

لائی حیات آئے، قضالے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

(جاءت بنا الحياة فأتينا. اختطفتنا الحياة فذهبنا.

لم نأت إلى هنا و لم نرحل من هنا بإرادتنا الخاصة)

و هذه حقيقة أكدها الشاعر لا يمكن إنكارها.

لكن هذا لا يعني أن الحياة رحلة لا معنى لها.

بل الحياة رحلة مع هدف و غاية۔ و رحلة لمكان مقصود۔ لا يمكن ان نضيع او قاتنا هنا، نلعب و نلهو و نفعل ما نشاء۔ الحياة ليست شيئًا عديم الفائدة يمكن أن نضيعه على وسائل التواصل الاجتماعي أو فقط فی الحصول على الإعجابات على Facebook أو Instagram و الحياة ليست شيئًا يمكن لنا ان نضيعه للهواتف المحمولة و الاجهزة الأخرى فحسب۔

لقد أرسلنا الله سبحانه و تعالى في هذا العالم مع هدف . و الهدف هو عبادته. و الهدف هو نشر الخير في هذا العالم. و الهدف هو نشر السعادة في هذ العالم. و الهدف هو مساعدة الآخرين و مسح دموع من يتألم و يبكي.

إن مثل نبينا الحبيب محمد صلى الله عليه و سلم موجود أمامنا. نبينا صلى ﷲ علیه و سلم لم يضيع لحظة واحدة من حياته. انظر الی او قاته کیف هو بذل مجهوداته لکی یجعل كل لحظة حياته نافعا و مفيدا له و للناس كلهم الی يوم القيامة۔ فهو عَبَدَ اللهَ لساعات طويلة جدا. و عَلّم أصحابه الإسلام. و هو قاتل في الحروب. و هو أمضى الوقت مع أفراد عائلته. و أيضا أدى دور القاضي في المدينة المنورة ليس فقط للمسلمين و لكن لليهود و أهل الديانات الأخرى. هذه مجرد لمحة عن عمله الشاق فی حياته و إلا كانت أوقاته مشغولة لدرجة أن الله وصفها بهذه الكلمات

اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبۡحاً طَوِیۡلاً (المزمل، ۷) لقد فعل كل هذه الأشياء و غيرها ليعلم امته أن الحياة و الوقت نعمة۔ كما قال نبينا عليه الصلاة و السلام:

نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس: الصحة و الفراغ۔ (رواه البخاري)

الحياة فی الدنيا رحلة لاستعداد حياة الآخرة، و لكن، للأسف، نرى أن كل منا و شبابنا (بشكل خاص) يضيعونها كأن الحياة شئی رخيص. و لما نحن نضيع الحياة اليوم، يجب علينا أن نكون مستعدين للإجابة امام الله سبحانه و تعالی لهذا الاثم الكبير أی اتلاف و اضاعة الحياة و و الوقت فی الدنيا۔

باختصار، إذا أردنا أن نعيش حياة أفضل في الآخرة فعلينا استغلال وقت هذه الحياة الدنيوية بشكل جميل. يجب أن نحاول و نجعل حياتنا الحالية مثمرة. و هو ما لا نفعله ابداً ـــ للأسف۔

خضّب كفك بالأشواق

خضِّب كفك بالأشواق
أجِّج قلبك بالأخطارْ
مهما كرّ جيش الحزن
اضحك وافرح بالإصرارْ
إن كان الهدْم موفورا
بشِّر قلبك بالإعمارْ
دعْه يرم دعه يَجرح
خيِّط جرحك بالأحجارْ
أَسكن من تحببه دوما
ليس القلب للإيجارْ
استأذن بالعين شوقا
باب القلب من أنظارْ

عش بالحب مت بالحب
الحب دين الأَبرارْ
ذَرْهم خلف الفرّاشات
واتّبع نجما بالمِسبارْ
صار الراكد ماءً عفِنا
سيِّل روحك بالأسفارْ
لا يُشبعْك بئر العلم
دعه واشرب من أنهارْ
إن أخطأت اِندم فورا
أَرضِ الرب بالإقرارْ
اصحَب من تصحبه خيرا
كن إن كنت خير الجارْ

اختَر من تُودعه سرا
ليس الكل للأسرارْ
لا تَخضَع للذل أبدا
هذا العار شر العارْ
كن حُرا أو مت من أجله
العيش عيش الأحرارْ
اتبَع دينك واثبُت واصمُ
في وجه أَعتَى الكفارْ
لا يكفيك كونك حقا
حتى تُمسك بالبتّارْ
لا تنقضْك القوة أبدا
القوةُ أمضى المعيارْ

بروفيسر شمس الرّب خان

سر الحياة

ما سر الحياة؟
بعض الناس بمجد الحظ يفرحون
والبعض محزونون وعيونهم بالدمع منهمرة
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

البعض لديهم كثير من الثروة لتكون باهظة
والبعض لتغطية نفقاتهم ليلاً ونهاراً عاملون
بينما ينام البعض وبطونهم جائعة
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

يرتدي البعض ملابس من الحرير مصنوعة
بينما يجد البعض في ارتداء الملابس صعوبة
لدى البعض أولادهم حصلوا على درجات الجامعة
بينما لا يستطيع البعض إرسال أطفالهم إلى المدرسة
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

يوجد في الأرض أناس من الأسود والأبيض وحياتهم يعيشون
يعيش البعض في البلدان الرأسمالية الغنية، في أوروبا وأمريكا وأستراليا
بينما يعيش البعض في دول أقل حظًا مثل الصومال وإثيوبيا
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

هناك البعض ممن يجلسون
في غرف مكيفة ويشاهدون التلفاز طوال اليوم
بينما هناك البعض ممن يعملون
تحت أشعة الشمس الحارقة طوال اليوم
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

هناك من ينامون على سريرهم سالمين
والبعض الذين ستنفجر منازلهم في أي لحظة
يرتجفون تحت سريرهم مرعوبين
هل تعتقد أنهم متماثلون؟

نعم، بينهم مادة مشابهة
وهي الإنسانية
وماذاتهم
هي الإنسانية

سمية بنت محمد فخر الإسلام
السنة الثالثة للبكالوريوس

رحلة من مومباي الى ماليغاون

أرمان أنصاري، السنة الثالثة للبكالوريوس

غالبًا ما أعيش في مومباي، لكن عندما أخطط للسفر من مومباي إلى ماليغاون، يطير قلبي فرحا لأن ماليغاون مدينة جميلة. المناظر الجميلة هناك آسرة. تستغرق الرحلة من مومباي إلى ماليغاون ٥ أو ٦ ساعات على الأقل. تقع مدينة ماليغاون في منطقة ناشك في ولاية ماهاراشترا، وهي صغيرة المساحة، ولكنها كبيرة جدًا من حيث عدد السكان. المدينة ذات أغلبية مسلمة. هذه هي ماليغاون نفسها التي كانت مسرحًا لتفجيرات وأعمال شغب، ولكن التحالف الهندوسي المسلم يجعل من ماليغاون مثالًا رائعًا في كل الهند. من جانب واحد يذهب رحمان للصلاة، وعلى الجانب الآخر يذهب رام للعبادة. وتسمى ماليغاون أيضًا مدينة المساجد والمآذن. وعندما يأتي الناس إلى المسجد، يتم التأكيد على الأخلاق والآداب والتعليم. هناك مؤسسات ومعاهد ضخمة في هذه المدينة يخرج منها الأطفال كل عام مليئين بالعلم والمعرفة والأخلاق. تعمل هذه المعاهد في مجالات مختلفة، مثل كلية الطب، وكلية القرآن، وكلية اللغة العربية، وكلية العلم الشرعي. تقدم هذه المعاهد جميع أنواع التعليم.

الجوّال

أنصاري ثناء، السنة الثالثة للبكالوريوس

الجوال نافع. نتكلم به الناس عن بعيد ونتواصل معهم. وفي هذه الأيام، صار الجوال ضروريا للحصول على التعليم أيضا لأن المحاضرات تتم على الجوال.

ولكن الجوال له مضاره أيضا إذا استخدمناه كثيرا وبلا ضرورة، أو للأشياء الفاسدة واللاأخلاقية. لذا يجب علينا أن نستخدم الجوال استخداما نافعا.

الأسرة مهمة

شيخ ذكية، السنة الثانية للبكالوريوس

اذهبوا إلى بيوتكم!

كلوا الطعام معا!

إخوتي الأعزاء، كونوا مع أفراد أسرتكم!

لا تقطعوا عنهم!

لا تضربوا أطفالكم وأزواجكم!

هذه النعمة ثمينة جدا! فاعرفوها واشكروها!

المعلم

فاطمة أنصاري محمد عارف، السنة الثالثة للبكالوريوس

المعلم يلعب دورا هاما في حياة المجتمع. المعلم نعمة لنا. يجب أن يحترم المعلم لأنه يمنحنا المعرفة. المعلم هو الذي يصنع الطبيب، والمهندس، والمدرس، والطيار وجميع أهل المهنة والحرفة. تصور كيف يكون هذا العالم بدون المعلم. خلاصة القول أن المعلم مثل أصل الشجرة، وبقية الأفراد مثل فروعها وأوراقها.

حبيبي تعال

كاشف شكيل
السنة الثالثة للبكالوريوس

حبيبي تعال محمد نبي فدنياك هذه
إلى ذي الجلال فقيد المثال وسيع المجال

تزود تزود كلام الرسول نجاة بكذب
لخير المآل نقيض الضلال محال محال

فحسن سلوكك أطع والديك فسوق وكفر
جمال الخصال على كل حال سباب قتال

تمسك تمسك لحق الثبات وكاشف صديقك
بدين الكمال بدون الزوال صدوق المقال

وقرآن ربك وطهر ثيابك
جواب السؤال تسود الرجال

أنت

رويدة محمد رويش
السنة الثالثة للبكالوريوس

أنت
أخبرت القمر... عنك.
عن عينيك، وشفتيك.
وكيف أغرق فيك للبقاء حيا.
لكنني أعتقد أن القمر شعرت بالغيرة من جمالك.
فعندما نظرت إلى الأعلى، كان القمر قد اختفى.
والشمس غمزت في وجهي.

الحياة

سارة ملك محمد عزيز، السنة الثالثة للبكالوريوس

الحياة أشبه برحلة في قطار بمحطاته مع تغيرات في الطرق ومع وقوع حوادث! عند الولادة، استقلنا القطار، والتقينا بوالدينا، ونعتقد أنهم سيسافرون دائمًا إلى جانبنا.

ولكن في بعض المحطات، سيتنحى آباؤنا عن القطار، ويتركوننا في هذه الرحلة بمفردنا.

مع مرور الوقت، سيركب أشخاص آخرون في القطار وسيكونون مهمين، منهم الإخوة، والأخوات، والأصدقاء، وسيتنحى الكثيرون ويتركون فراغًا دائمًا.

سوف يمر الآخرون دون أن يلاحظهم أحد حتى أننا لا ندرك أنهم قد أخلوا مقاعدهم.

ستكون رحلة القطار هذه مليئة بالفرح والحزن والخيال والآمال والترحيب والوداع والوداع. لذلك يجب أن نعيش بأفضل طريقة لأنه عندما يحين وقت التنحي، يجب أن نترك وراءنا ذكريات جميلة لأولئك الذين سيواصلون السفر في قطار الحياة.

"يومًا ما سترى وميضا لحياتك يمرّ أمام عينيك، تأكد من جعلها تستحق المشاهدة".